انشا اور تلفظ

رشید حسن خاں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی

اشتراک

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی

Insha Aur Talaffuz
by
Rasheed Hasan Khan
Rs.45/-

صدر دفتر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025 ☎ 011-26987295

Email: monthlykitabnuma@gmail.com

شاخیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد دہلی۔110006 ☎ 011-23260668

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ، ممبئی۔400003 ☎ 022-23774857

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔202002 ☎ 0571-2706142

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، بھوپال گراؤنڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025 ☎ 011-26987295

قومی اردو کونسل کی کتابیں مذکورہ شاخوں پر دستیاب ہیں

سنہ اشاعت: 2011 تعداد: 1100 قیمت: -/45 روپے

ISBN :978-81-7587-539-5 سلسلۂ مطبوعات: 1445

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی۔110025

فون نمبر: 49539000 فیکس: 49539099

ای میل: urducouncil@gmil.com ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in

طابع: جے۔کے۔آفسیٹ پرنٹرز، بازار مٹیا محل، جامع مسجد۔110006

اس کتاب کی چھپائی میں 70 GSM TNPL Maplitho کاغذ کا استعمال کیا گیا ہے۔

معروضات

قارئین کرام! آپ جانتے ہیں کہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ایک قدیم اشاعتی ادارہ ہے، جو اپنے ماضی کی شاندار روایات کے ساتھ آج بھی سرگرم عمل ہے۔ 1922ء میں اس کے قیام کے ساتھ ہی کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا جو زمانے کے سرد و گرم سے گزرتا ہوا آگے کی جانب گامزن رہا۔ درمیان میں کئی دشواریاں حائل ہوئیں، نامساعد حالات سے بھی سابقہ پڑا مگر سفر جاری رہا اور اشاعتوں کا سلسلہ کلی طور پر کبھی منقطع نہیں ہوا۔

اس ادارے نے اردو زبان و ادب کے معتبر و مستند مصنّفین کی سیکڑوں کتابیں شائع کی ہیں۔ بچوں کے لیے کم قیمت کتابوں کی اشاعت اور طلبا کے لیے ''درسی کتب'' اور ''معیاری سیریز'' کے عنوان سے مختصر مگر جامع کتابوں کی تیاری بھی اس ادارے کے مفید اور مقبول منصوبے رہے ہیں۔ ادھر چند برسوں سے اشاعتی پروگرام میں کچھ تعطل پیدا ہو گیا تھا جس کی وجہ سے فہرست کتب کی اشاعت بھی ملتوی ہوتی رہی مگر اب برف پگھلی ہے اور مکتبہ کی جو کتابیں کمیاب بلکہ نایاب ہوتی جارہی تھیں شائع ہو چکی ہیں۔ زیر نظر کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اب تمام کتابیں مکتبہ کی دلّی، ممبئی اور علی گڑھ شاخوں پر دستیاب ہیں اور آپ کے مطالبہ پر بھی روانہ کی جائیں گی۔

اشاعتی پروگرام کے جمود کو توڑنے اور مکتبہ کی ناؤ کو بھنور سے نکالنے میں مکتبہ جامعہ بورڈ آف ڈائرکٹرس کے چیئرمین اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر جناب نجیب جنگ (آئی اے ایس) کی خصوصی دلچسپی کا ذکر ناگزیر ہے۔ موصوف نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے فعّال ڈائرکٹر جناب حمید اللہ بھٹ کے ساتھ (مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے درمیان) ایک معاہدے کے تحت کتابوں کی اشاعت کے معطل شدہ عمل کو نئی زندگی بخشی ہے۔ اس سرگرم عملی اقدام کے لیے مکتبہ جامعہ کی جانب سے میں ان صاحبان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ امید ہے کہ یہ تعاون آئندہ بھی شاملِ حال رہے گا۔

خالد محمود

منیجنگ ڈائرکٹر، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

مرزا ادیب کے نام

جن کا نام بچّوں کے ادیب کی حیثیت سے بھی ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

رشید حسن خاں
۱۷ دسمبر ۱۹۹۲ء

حرفِ آغاز

اِملا پر تو پچھلے پندرہ بیس سال میں بہت سا کام ہوا ہے، مگر انشا پر اگر کچھ لکھا گیا ہے، تو اُسے نہ ہونے کے برابر کہا جاسکتا ہے۔ ایک مشکل یہ ہے کہ اردو کے طالب علموں کے لیے ایسے ضروری موضوعات پر کچھ پڑھنے کی گنجایش کم سے کم ہوتی جاتی ہے۔ اِس سے بھی بڑی مشکل یہ ہے کہ اساتذہ کی توجہ بھی اِس طرف گویا مبذول نہیں ہوتی۔ اِس میں حالات کے جبر کا حصّہ اتنا نہیں جتنا دخل ہماری بے اعتنائی کو ہے۔ طالب علم مجبور سہی، استاد اُس قدر مجبور نہیں ہوتا۔ وہ اگر املا اور انشا کے ضروری اجزا کو اچھی طرح جانتا ہو، تو اپنے طلبہ کو بہ قدرِ ضرورت بتا سکتا ہے۔ یہ امکان ہمیشہ رہے گا کہ بہت سے طالب علموں میں سے چار چھے، یا دس بارہ ایسے طالب علم نکل آئیں جو اِن موضوعات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ اِس طرح زبان کے متعلقات کا شعور پیدا ہوتا رہے اور سلسلہ پوری طرح ٹوٹنے نہ پائے۔

لفظ کس طرح لکھا جائے، یہ املا کا مسئلہ ہے۔ جملہ کس طرح لکھا جائے، یہ انشا کا مسئلہ ہے۔ عبارت کی خوبیوں اور خامیوں کا تعلّق بھی انشا سے ہوتا ہے۔ یوں انشا کی اہمیت کچھ کم نہیں۔ اساتذہ اگر اِن مسائل کو اچھی طرح جانتے ہوں تو پھر وہ مختلف موقعوں پر بعض نہایت ضروری باتوں کو اپنے طلبہ تک پہنچا سکتے ہیں۔

انشا وسیع موضوع ہے۔ اِس مختصر سی کتاب میں اُس سے متعلق ساری معلومات کو یک جا کر دینا مقصود نہیں، اِسی لیے ضروری باتوں کو اختصار کے ساتھ لکھا گیا ہے۔

رشید حسن خاں
گائر ہال۔ دہلی یونی ورسٹی، دہلی

انشا

جملہ، لفظوں سے بنتا ہے۔ جملوں سے عبارت بنتی ہے۔ اچھی عبارت کے لیے ضروری ہے کہ جملے بے عیب ہوں۔ بے عیب جملے ہم اُس وقت لکھ سکتے ہیں جب لفظوں کو اچھی طرح جانتے ہوں۔ اچھی طرح جاننے کا مطلب یہ ہے کہ تین باتیں ضرور معلوم ہوں: (۱) لفظ کا صحیح املا کیا ہے۔ (۲) اُس کے معنی کیا ہیں۔ (۳) جملے میں اُس لفظ کو کس طرح لانا چاہیے۔ اِس تیسری بات میں قواعد، روزمرّہ، محاورہ؛ یہ سب شامل ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ قواعد کی غلطی نہ ہو، اِسی کے ساتھ ساتھ روزمرّہ اور محاورہ بھی درست ہو۔

ذرا دیر کے لیے مان لیجیے کہ آپ نے یہ جملہ لکھا: اِس دفعہ اُن کو سونے کا تمغہ ملا ہے۔ اِس میں قواعد کے لحاظ سے کوئی عیب نہیں، اِس کے باوجود یہ جملہ بے عیب نہیں۔ خرابی یہ ہے کہ ایک لفظ کا املا ٹھیک نہیں۔ اصل لفظ "تمغا" ہے۔ املا کی اِس ایک غلطی نے پورے جملے کو بگاڑ دیا۔

میں نے ایک بار ایک جملہ اِس طرح لکھا تھا: سب عورتیں وہاں بیٹھیں ہوئیں تھیں۔ میرے استادِ محترم نے سمجھایا تھا کہ اِس جملے میں فعل صحیح صورت میں نہیں آیا۔ یوں لکھنا چاہیے تھا: سب عورتیں وہاں بیٹھی ہوئی تھیں ــــ یہ قواعد کی غلطی ہوئی۔

ہمارے ایک مشہور شاعر کا مصرع تھا: "گھٹائیں چشمِ عنایت اِدھر نہ فرمائیں"۔ مشہور نقّاد نیاز فتح پوری نے اِس پر یہ اعتراض کیا تھا کہ "عنایت فرمانا" محاورہ ہے "چشمِ عنایت فرمانا" محاورہ نہیں ــــ اِس طرح معلوم ہوا کہ جملہ ہو یا مصرع، اُس میں محاورے کو اصلی شکل میں آنا چاہیے۔ یہ تو آپ کو معلوم ہوگا کہ محاوروں میں نہ تو کسی لفظ کو بدل سکتے ہیں، نہ کوئی لفظ کم کر سکتے ہیں، نہ بڑھا سکتے ہیں۔ شاعر نے اصل محاورے "عنایت فرمانا" میں ایک لفظ "چشم" بڑھا دیا اور بات بگڑ گئی ــــ اِس مصرعے میں یہ زبان کا عیب ہوا۔

ایک پرانی بات یاد آگئی۔ بے تکلّف دوستوں کی محفل جمی ہوئی تھی، ایک صاحب نے کہا: باہر زور کی بارش پڑ رہی ہے۔ دوسرے صاحب نے تائید کی: ہاں بھائی، بہت زور کی بارش گر رہی ہے۔ حاضرین میں سے ایک صاحب نے کہا: بارش پڑنا اور بارش گرنا، دونوں روزمرّہ کے خلاف ہیں۔ "بارش ہونا" اور "پانی برسنا" کہتے ہیں۔ وہ دونوں حضرات بھری محفل میں شرمندہ ہو کر رہ گئے۔

روزمرّہ کی تعریف تو آپ جانتے ہوں گے۔ اِس کا مطلب ہے: اُس طرح لکھنا یا بولنا، جس طرح معیاری اُردو میں بولتے اور لکھتے آئے ہیں۔ مثلاً کوئی صاحب کہیں: "آب پی لو"، تو کہا جائے گا کہ اُردو والے اِس طرح نہیں بولتے۔ "پانی پی لو" کہتے ہیں۔ "آب" کے معنی ہیں: پانی۔ لفظ اپنی جگہ ٹھیک ہے، بامعنی ہے، دوسرے مقامات پر استعمال میں بھی آتا ہے؛ لیکن "پینے" کے ساتھ "پانی" کا لفظ آتا ہے۔

یا جیسے یہ کہا جائے کہ "اُن کا تو پانی دانہ اُٹھ گیا ہے"۔ اِس پر بھی کہا جائے گا یہ روزمرّہ کے خلاف ہے۔ روزمرّہ کے لحاظ سے "دانہ پانی" کہنا چاہیے تھا، یعنی: اُن کا تو دانہ پانی اُٹھ گیا ہے۔ یا جیسے کوئی صاحب کہیں: "آپ وہاں جاؤ"۔ کہا جائے گا کہ یہ مناسب اندازِ بیان نہیں۔ "آپ وہاں جائیے" اور "تم وہاں جاؤ" کہتے ہیں۔ اُردو کے مشہور شاعر فیض احمد فیض کی غزل کا

ایک شعر ہے:

خیر، ہیں اہلِ دَیر جیسے ہیں آپ اہلِ حرم کی بات کرو

دوسرے مصرعے پر یہ بھی اعتراض کیا گیا ہے کہ "آپ بات کرو"، صحیح اندازِ بیان نہیں۔ "آپ بات کیجیے" کہنا چاہیے، یا "تم بات کرو" کہہ سکتے ہیں۔

اب ہم مختصر طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ بے عیب تحریر وہ ہے جس میں روزمرہ اور محاورے کی غلطی نہ ہو، قواعد کی غلطی نہ ہو اور املا کی بھی غلطی نہ ہو۔

یہ ٹھیک ہے کہ بے عیب عبارت لکھنا اچھی بات ہے، لیکن یہی سب کچھ نہیں، اچھی عبارت وہ ہے جو بے عیب بھی ہو اور اُس میں بیان کا حُسن بھی ہو۔ ایک ہی بات کو کئی طرح کہا جا سکتا ہے، ذہین طالبِ علم اِس بات کو جلد ہی سمجھ لیتے ہیں۔ وہ کوشش کرتے ہیں کہ اچھّے سے اچھے اندازِ بیان کو اپنائیں۔ اِس طرف توجہ کرنے سے اور مشق سے اچھّی نثر لکھنے کا سلیقہ آتا ہے۔ مولانا حالی کا یہ مصرعِ ہمیشہ نظر کے سامنے رہنا چاہیے:

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں

اچھّی نثر لکھنے کا کوئی مقرّرہ قاعدہ نہیں۔ سوچنے سمجھنے سے یہ بات اپنے آپ ذہن پر روشن ہونے لگتی ہے۔ کبھی ایسا کیجیے کہ ایک ہی جملے کو دو تین طرح لکھ کر دیکھیے۔ ایک دو بار لفظوں کی ترتیب بدل دیجیے، ایک دو لفظوں کو نکال دیجیے، یا ایک دو لفظوں کو بدل کر دیکھیے۔ آپ کو محسوس ہونے لگے گا کہ ایک ہی جملے کی اُن کئی شکلوں میں سے کوئی ایک صورت ایسی بھی ہے جو دوسری صورتوں سے بہتر معلوم ہوتی ہے۔

جملے میں جو لفظ لائے جائیں، تو سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ مطلب کو اچھّی طرح ادا کر رہے ہیں؟ ایسا تو نہیں کہ ایک یا دو لفظ بدل دیے جائیں تو پہلے کے مقابلے میں مفہوم بہتر طور پر ادا ہو سکے گا۔ گویا اچھّا جملہ لکھنے کے لیے مناسب لفظوں کا انتخاب پہلی ضروری بات ہے۔ دوسری ضروری بات یہ ہے کہ جن مناسب لفظوں کو منتخب کیا جائے، جملے میں اُن کی ترتیب بھی مناسب طور پر ہونا چاہیے۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ بعض دفعہ کسی جملے میں کسی

ایک لفظ کو اِدھر اُدھر کر دینے سے بیان کا حُسن بڑھ جاتا ہے، اور کبھی مفہوم کو ادا کرنے کی بہتر صورت سامنے آجاتی ہے۔

یہ بات بھی دیکھنے کی ہوتی ہے کہ وہ جملہ جب زبان سے ادا ہوگا تو اُس میں روانی کتنی ہوگی۔ کوئی ایسا لفظ تو نہیں آگیا ہے جس کو ادا کرنے میں زبان رُکنے لگے۔ اچھّی نثر کی ایک خوبی یہ بھی ہوتی ہے کہ اُس میں روانی ہوتی ہے، رُکاوٹ نہیں ہوتی۔ محض مثال کے طور پر اِس جملے کو دیکھیے: "تم یہاں سے کل کیا چلے گئے کہ گھر کی رونق ہی چلی گئی۔" اِس جملے کا مطلب تو روشن ہے، مگر بیان کا حُسن نہیں آپایا۔ جملے کے پہلے ٹکڑے "کل کیا گئے کہ" کو زبان سے ادا کرتے وقت روانی کی سانس ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

اِس کے علاوہ، اِس جملے میں جتنے لفظ آئے ہیں، اُن سب کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ اُن میں سے ایک دو لفظوں کو کم کیا جا سکتا ہے، مثلاً اِس طرح: "گھر کی رونق تمھارے ساتھ ہی چلی گئی تھی۔" مطلب پورا کا پورا ادا ہو گیا اور اب اچھّی طرح ادا ہوا کہ بیان کا حُسن بھی شامل ہو گیا ہے۔

ہاں اِس جملے کو یوں بھی لکھا جا سکتا تھا: "گھر کی رونق تو تمھارے ساتھ ہی چلی گئی تھی" مگر یہ بہتر صورت نہیں۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ "تو تمھارے" میں ت کے دوبار ایک ساتھ تلفّظ میں آنے سے روانی کم ہو جاتی ہے۔ اِس جملے کو ایک بار پڑھ کر دیکھیے، آپ خود محسوس کر لیں گے کہ "تو تمھارے" کو ادا کرتے وقت زبان میں لکنت سی آجاتی ہے۔ یہ خوبی نہیں، خامی ہے۔ "کل کیا گئے کہ" میں بھی یہی خامی تھی۔

کسی اچھّے جملے کو دو تین بار پڑھیے، آپ محسوس کریں گے کہ ایک خاص طرح کا آہنگ اور ایک خاص طرح کی نغمگی اُس کے اندر موجود ہے۔ جملے میں جتنی روانی ہوگی، اُسی نسبت سے اُس میں وزن اور آہنگ کی لہریں پیدا ہوں گی۔ روانی ٹوٹنے لگے گی، تو وہ آہنگ بھی ٹوٹنے لگے گا۔

شاعری میں تو اِس پہلو پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ ایک ہی مثال سے اِس کی وضاحت ہو جائے گی۔ (تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں)۔ مولانا شبلی نے

میر انیس کی شاعرانہ خوبیوں پر بحث کرتے ہوئے ایک جگہ دو مصرعے لکھے ہیں۔ اُن دونوں مصرعوں میں ایک ہی بات کہی گئی ہے۔ ایک مصرع یہ ہے: "تھا بلبلِ حق گو کہ چہکتا تھا چمن میں"۔ اِسی بات کو دوسرے مصرعے میں اِس طرح کہا گیا ہے: "بلبل چہک رہا تھا ریاضِ رسول میں"۔ آپ نے دیکھا پہلے مصرعے میں روانی کی کمی ہے۔ لفظوں کے غیر مناسب انتخاب سے یہ خرابی پیدا ہوئی ہے۔ خاص کر "گو کہ" سے روانی بے طرح ٹوٹ گئی ہے۔ اِس کے مقابلے میں دوسرا مصرع کیسا رواں ہے! پڑھ کر دیکھیے، زبان کہیں نہیں رُکے گی۔ اِسی خوبی نے اِس مصرعے کو پہلے مصرعے سے بہتر بنا دیا ہے۔ اِس سلسلے کی کچھ اور باتیں ذرا آگے چل کر بیان کی جائیں گی۔

○

جملے دو طرح کے ہوتے ہیں: مُفرد، مُرکّب۔ "مرکّب جملے" وہ ہوتے ہیں جو دو یا زیادہ مفرد جملوں سے مل کر بنے ہوں۔ مثلاً اِس جملے کو دیکھیے: "وہ کل یہاں سے گئے تھے، لیکن آج پھر واپس آگئے اور آتے ہی جم کر بیٹھ گئے، مگر اُن کے آتے ہی کچھ دوسرے لوگ بھی آگئے اور وہ لوگ بھی اُن سے باتیں کرنے لگے، یوں سارا دن گزر گیا"۔
اِس طویل جملے میں پانچ چھوٹے چھوٹے جملے شامل ہیں۔ لمبے مُفرد جملے لکھنا یا طویل مرکّب جملے لکھنا غلط نہیں۔ بہت سے مقامات پر اُن کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہاں کہنے کی بات یہ ہے کہ مختصر جملوں میں اگر مفہوم آسانی کے ساتھ ادا ہو سکتا ہو، تو پھر طویل جملے لکھنے کی ضرورت نہیں، اِسے غیر مناسب کہا جائے گا۔ مثال کے طور پر اوپر والے طویل جملے کو دیکھیے۔ اُس میں سے "لیکن"، "اور"، "مگر"، یہ تین لفظ کم کر دیے جائیں، تو یہ ضرورت سے زیادہ لمبا جملہ، چھوٹے چھوٹے جملوں میں تقسیم ہو جائے گا: وہ کل ہی تو گئے تھے، آج واپس آگئے۔ آتے ہی جم کر بیٹھ گئے۔ اُن کے آتے ہی کچھ اور لوگ بھی آگئے۔ یہ لوگ بھی اُن سے باتیں کرتے رہے۔ یوں سارا

دن گزر گیا۔
لمبے لمبے جملوں میں کبھی یہ خرابی پیدا ہو جاتی ہے کہ زائد لفظ شامل ہو جاتے ہیں۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ مفہوم کی تکرار ہو جاتی ہے کہ ایک ہی بات کو بار بار کہا جاتا ہے۔ عبارت میں زائد یعنی فالتو لفظ ہوں، اِسے عیب کہا جائے گا۔ اِسی طرح مفہوم کی تکرار ہو، تو اِسے بھی خرابی مانا جائے گا۔ نئے لکھنے والوں کو شروع میں اِس کا اچھی طرح اندازہ نہیں ہو پاتا۔ جب مشق ہو جائے اور لکھنا آ جائے، تب ضرورت کے مطابق ہر طرح کے جملے لکھے جا سکتے ہیں۔ شروع میں مُفرد جملے کو مرکّب جملے پر ترجیح دینا چاہیے۔ یہ بھی کوشش کرنا چاہیے کہ جملے ضرورت سے زیادہ طویل نہ ہوں۔
ایک مثال سے اِس کی وضاحت اچھی طرح ہو سکے گی۔ ایک تنقیدی مضمون میں لکھے گئے اِس جملے کو دیکھیے:

> "مرزا عبد القادر بیدل، مرزا غالب اور مرزا یاس یگانہ چنگیزی کی روایاتِ فکر و فن کے امین، کلاسیکی زبان و ادب سے اُستادانہ واقفیت اور اپنے وسیلۂ اظہار پر مکمّل دسترس رکھنے والے، تجزیہ و تفتیش کے مراحل سے گزر کر اپنے پیرایۂ بیان کو زیادہ سے زیادہ شخصی، انفرادی اور مکمّل بنانے والے، زمان و مکان کے مسائل کو عشق و وجدان کے تناظر میں قلم بند کرنے والے شاعر نے اُردو غزل میں کیسے کیسے گراں قدر اشعار کا اضافہ کیا ہے، جن کی کیفیت سدا بہار ہے، جن کی لطافت و اثر آفرینی قائم و دائم ہے"۔

یہ ایک جملہ ہے۔ جملہ کیا ہے، شیطان کی آنت ہے۔ اِس سے لکھنے والے کا اناڑی پن ظاہر ہوتا ہے۔ شروع میں مشق کم ہوتی ہے اور معلومات زیادہ نہیں ہوتی، یہی وجہ ہے کہ مختصر اور مفرد جملے لکھنے پر زور دیا جاتا ہے۔ ابتدا میں اچھی عبارت لکھنا آ جائے، تو پھر یہ خوبی قلم کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ شروع میں اِس طرف توجّہ نہ کی جائے، تو پھر زندگی بھر اِس خرابی کو بھگتنا

پڑتا ہے۔ اوپر جس طویل جملے کو نقل کیا گیا، وہ اِس کا مُنہ بولتا ثبوت ہے۔
کبھی خواجہ حسن نظامی کا کوئی مضمون مل جائے، تو اُسے دل لگا کر اور نظر جما کر پڑھیے گا۔ آپ دیکھیں گے زیادہ تر مختصر جملے ہیں۔ بیان میں سادگی اور صفائی ہے۔ عربی فارسی کے مشکل لفظ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ چھوٹے چھوٹے جملوں نے عبارت کو چُست بنا دیا ہے۔ فالتو لفظوں کا پتا نشان نہیں ملے گا۔ عبارت اِس صفائی کے ساتھ مطلب کو ادا کر رہی ہے جیسے نظر شیشے کے پار ہو جاتی ہے۔ طاقت سے بھری ہوئی روانی ایسی ہے جیسے جھرنا بہ رہا ہو ـــــ اچھّی نثر میں یہی خوبیاں ہوتی ہیں۔

عربی اور فارسی سے اردو نے بہت فیض پایا ہے۔ اِن زبانوں کے بہت سے لفظ اردو میں شامل ہیں۔ یہ لفظ ہماری زبان میں اِس طرح گھُل مِل گئے ہیں کہ غیریت باقی نہیں رہی۔ اِن دونوں زبانوں کے ساتھ ساتھ ہندی اور بعض دوسری ہندستانی زبانوں کے لفظ بھی ہماری زبان میں موجود ہیں۔ پچھلے دو سو برسوں میں انگریزی کے بہت سے لفظ اردو میں شامل ہو گئے ہیں۔ ہاں، یہ خیال رہے کہ عربی اور فارسی کے مقابلے میں، دوسری زبانوں کے لفظوں کی تعداد زیادہ ہے۔ فعل تو سب ہندی سے آئے ہیں (البتّہ اردو نے اُن کو اپنے رنگ میں رنگ لیا ہے)۔

محاورے اور کہاوتیں (ضربُ الامثال) ایسے آئینے ہوتے ہیں جن میں اُس ملک کی تہذیب کی تصویریں دکھائی دیتی ہیں۔ محاورے عام طور پہ ہماری مشترکہ تہذیب کے عکس دکھاتے ہیں۔ اِسی طرح کہاوتوں میں ہماری زندگی کی چھوٹی چھوٹی تصویریں نظر آتی ہیں۔ محاوروں اور کہاوتوں میں عربی، فارسی الفاظ کی تعداد کم سے کم ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اردو ایک ملی جلی زبان ہے۔ اِس میں عربی، فارسی کے لفظ اچھی خاصی تعداد میں ہیں، لیکن دوسری زبانوں کے لفظوں کی تعداد زیادہ ہے۔ مختلف زبانوں کے لفظ مل جل کر ایک ہی زبان کے سانچے میں ڈھل گئے ہیں۔ اب ہم اِن سب لفظوں کو اردو کے لفظ

مانتے ہیں۔ اِس کو یوں بھی دیکھیے کہ ایسے اکثر لفظوں کا اِملا تو نہیں بدلا لیکن تلفّظ بہت سے لفظوں کا بدل گیا۔ عربی، فارسی کے لفظوں کو ہم اُن زبانوں کے تلفّظ کے مطابق زبان سے ادا نہیں کرتے، کر بھی نہیں سکتے۔ اُردو والوں کا جو تلفّظ ہے، اُس کے مطابق سبھی لفظ استعمال میں آتے ہیں۔ کوئی کہے بھی کہ عربی میں تو اِس لفظ کا تلفّظ یہ ہے، تو ہم کہتے ہیں کہ ہاں، جب عربی بولیں گے تو یہی تلفّظ اختیار کر لیں گے۔

لکھتے وقت ہم یہ نہیں دیکھتے کہ عبارت میں جو لفظ آئے ہیں، وہ اصلاً کس زبان سے تعلّق رکھتے ہیں۔ دیکھنا بھی نہیں چاہیے۔ ہاں، ہم ایک پہلو پر ضرور نظر رکھتے ہیں کہ ممکن حد تک مشکل لفظ ہماری عبارت میں نہ آنے پائیں۔ مفہوم کو ادا کرنے کے لیے آسان لفظ موجود ہیں، تو پھر مشکل لفظوں کو عبارت میں نہیں ٹھونسنا چاہیے۔ اِس ٹھونسم ٹھانس سے عبارت بے لطف ہو جاتی ہے، بندش کی چُستی باقی نہیں رہتی اور روانی ختم ہو جاتی ہے۔ چلتی گاڑی میں روڑا اٹکانا اِسی کو کہتے ہیں۔ پڑھتے وقت لُغت کی کتاب سامنے رکھنا ضروری ہو، تو وہ نثر کیا ہوئی! یہ تو بے کمالی بل کہ بے ہنری کی پہچان ہے۔

مثال کے طور پر اِس مختصر سی عبارت کو دیکھیے: ''مجھے جب بھی اشتہا ہوتی تھی، میں فواکہات سے شکم پُری کر لیا کرتا تھا۔ اِسی طرح وہ شش ماہہ مدّت گزر گئی اور یومِ رہائی آ گیا۔''
کس قدر بے ہنگم عبارت ہے! مشکل لفظوں کے پتّھر بچھا دیے گئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والے کو خوش مذاقی چھو بھی نہیں گئی۔ اِس عبارت کو اِس طرح بھی لکھا جا سکتا تھا: ''مجھے جب بھی بھوک لگتی تھی، پھلوں سے پیٹ بھر لیا کرتا تھا۔ اِسی طرح وہ چھے مہینے گزر گئے اور رہائی کا دن آ گیا۔''

لفظوں کے انتخاب میں خاص طور پر اِس کا لحاظ رکھنا چاہیے۔ مثال کے طور پر ''حتیٰ الامکان'' کی جگہ ''امکان بھر'' اور ''علی الصّباح''

کے بجائے "صحیح ترکے" لکھ سکتے ہیں۔ یا جیسے :"یہ امر میرے لیے باعثِ
مسرت ہوگا۔" اِس کی جگہ سادہ سا جملہ لکھا جا سکتا تھا، مثلاً: اِس سے
مجھے مسرّت حاصل ہوگی۔ یا ایسا ہی کوئی اور جملہ۔ "امر" اور "باعث" جیسے
مشکل لفظ لکھنے کی کیا ضرورت ہے، جب کہ اِن کے ہم معنی آسان لفظ
موجود ہیں۔

ایسی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ جس طرح عربی فارسی لفظوں
سے خواہ مخواہ بچنا غیر مناسب ہے، اُسی طرح بے ضرورت اُن کو عبارت
میں شامل کرنا بھی مناسب نہیں۔ لفظوں کے انتخاب میں بس یہ پہلو
سامنے رہنا چاہیے کہ مطلب صحیح طور پر ادا ہو جائے اور ممکن حد تک
عبارت میں سادگی رہے۔ اِس کے بجائے، اگر علم کی نمائش مقصود ہو، تو
اُس کو بدذوقی اور نامعقولیت کہا جائے گا۔ یا پھر یہ کہا جائے گا کہ لکھنے
والا اناڑی ہے۔

دو طالبِ علم باتیں کر رہے تھے۔ ایک نے کہا: "مارننگ میں ایک فرینڈ
کے گھر گیا تھا۔ پھر فادر کے ساتھ شاپنگ کرنے نکل گیا۔ آفٹر نون میں
پلے گراؤنڈ پر گیا۔ وہاں ٹی بریک کے بعد کھیل کی بگننگ بس ہوئی تھی"۔
آپ نے ضرور محسوس کر لیا ہوگا کہ اِن صاحب کی گفتگو میں انگریزی کے
لفظ غیر ضروری طور پر استعمال میں آئے ہیں۔ انگریزی کے بہت سے لفظ
ہماری زبان میں شامل ہو چکے ہیں اور اردو زبان کا حصّہ بن گئے ہیں۔
یہ ایسے لفظ ہیں جن کا بدل ہمارے پاس موجود نہیں۔ جیسے: اسٹیشن،
اسکول، میزائل، تھرمامیٹر، اڈیٹر، آکسیجن، ہائڈروجن، ناول، فلم،
ٹیلی ویژن، ریفریجیٹر، لاؤڈ اسپیکر، پنسل، ایٹم۔ غرض کہ ایسے بہت سے لفظ
ہیں۔ اب یہ سب لفظ اردو کے اپنے لفظ ہیں۔ اگر کوئی شخص مثلاً لاؤڈ اسپیکر
کی جگہ "آلۂ مکبّر الصوت" استعمال کرے یا جیسے تھرمامیٹر کی جگہ "مقیاس
الحرارت" کہے، تو سمجھا جائے گا کہ یہ شخص زبان کو مشکل اور بوجھل بنانا

چاہتا ہے۔ اِس کو اچھا نہیں سمجھا جائے گا۔ اِسی طرح جن لفظوں کے بدل
ہمارے پاس پہلے سے موجود ہیں، اُن کی جگہ انگریزی لفظ لانا بے تُکے پن کی
بات ہے۔ اِس سے گفتگو اور تحریر، دونوں کا رنگ بگڑ جائے گا۔ اوپر
جس گفتگو کا حوالہ دیا گیا ہے، اُس کا بھی یہی احوال ہے۔ اِسے بگڑی ہوئی
اردو کہا جائے گا۔ وجہ یہ ہے کہ اِس میں انگریزی کے جتنے لفظ آئے ہیں، وہ
سب غیر ضروری طور پر بھرے گئے ہیں۔ آسانی کے ساتھ یہ کہا جا سکتا تھا کہ
میں صبح کے وقت ایک دوست کے گھر گیا تھا۔ پھر والد صاحب کے ساتھ
کچھ خریدنے کے لیے بازار چلا گیا۔ سہ پہر کو کھیل کے میدان میں پہنچا، وہاں
چائے کے وقفے کے بعد کا کھیل بس شروع ہوا تھا۔

ایک ادبی رسالے کے اڈیٹر نے دسمبر۔ فروری ۱۹۹۲ء کے شمارے میں
لکھا ہے: "ساہتیہ اکادمی جیسے معتبر ادارے کے اعلان سے بہت پہلے
انعام پانے والے کا نام مصدّقہ انداز میں سرکولیشن میں آتا رہا ہے"۔ "سرکولیشن
میں آتا رہا ہے" بے جوڑ ٹکڑا ہے۔ یہاں انگریزی کا ایک لفظ غیر ضروری طور
پر شاملِ عبارت ہوگیا ہے۔ اِس کی جگہ عام فہم اردو لفظ بہ آسانی لایا جا سکتا
تھا۔ ایسی بے جوڑ پیوند کاری عبارت کو خراب کر دیا کرتی ہے۔ پُرانے لوگ
ایسی زبان کو "گورا شاہی اردو" کہا کرتے تھے۔ ایسی گفتگو یا تحریر سے یہ
ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شخص بدذوق بھی ہے اور مناسب و غیر مناسب لفظوں کے
انتخاب اور استعمال میں جو فرق ہوتا ہے، اُس سے بھی واقف نہیں۔

عبارت کی خرابی میں زائد لفظوں کا حصّہ بھی کچھ کم نہیں ہوتا۔ زائد لفظوں سے
مراد ہیں ایسے لفظ جن کو اگر نکال دیا جائے، تو مفہوم پر اثر نہ پڑے اور
عبارت پہلے سے بہتر ہو جائے۔ پنڈت ہری چند اختر اپنے زمانے کے مشہور
شاعر اور ادیب تھے۔ انھوں نے ایک بار ایک نئے لکھنے والے سے کہا
تھا: یہ تو بہتوں کو معلوم ہوتا ہے کہ کیا لکھنا ہے، لیکن یہ بات کم لوگوں

کو معلوم ہوتی ہے کہ کیا نہیں لکھنا ہے"۔ کیسی اچھی بات کہی تھی!
ایک مشہور مجسمہ ساز سے لوگوں نے پوچھا کہ آپ اِس قدر خوب صورت مجسمے کیسے بنا لیتے ہیں۔ اُس نے جواب دیا: میں پتھر کی سِل میں سے فالتو حصے نکال دیتا ہوں۔ باکمال اُستاد نے ایک جملے میں پوری بات کہہ دی! اور بات بھی کیسی، جس کی تشریح کی جائے تو کئی صفحے لکھے جا سکتے ہیں۔

○ —— اِس جملے کو دیکھیے: چوں کہ وہ بیمار تھے، اِس لیے میں اُن کو دیکھنے کے لیے گیا تھا —— اب اِس جملے کو اِس طرح لکھ کر دیکھیے: وہ بیمار تھے، اِس لیے میں اُن کو دیکھنے گیا تھا۔ مفہوم وہی رہا، اُس میں ذرا سی بھی کمی نہیں ہوئی۔ "چوں کہ" اور "کے لیے" کے نکل جانے سے جملہ بہتر ہو گیا۔

○ —— ایک اور جملہ: وہ اگرچہ مصروف نہیں تھے، مگر وہ میرے پاس نہیں بیٹھے۔ اِس کو اِس طرح لکھ کر دیکھیے: وہ مصروف نہیں تھے، مگر میرے پاس نہیں بیٹھے۔ جملے کے شروع میں "اگرچہ" زائد ہے۔ اِسی طرح "وہ" کی تکرار بھی غیر ضروری ہے۔ دو زائد لفظ نکل گئے تو جملہ بہتر ہو گیا۔

○ —— "ہم نے سارا سامان تیار کر لیا تھا، مگر اِس کے باوجود اُنھوں نے یہاں ٹھہرنا پسند نہیں کیا، شام ہی کو چلے گئے"۔
دوسرے جملے کے شروع میں "مگر اِس کے باوجود" آیا ہے۔ اِس میں سے "مگر" کو نکال دیجیے اور یوں لکھ کر دیکھیے: ہم نے سارا سامان تیار کر لیا تھا، اِس کے باوجود اُنھوں نے ..... —— اب اِسی کو یوں لکھیے: ہم نے سارا سامان تیار کر لیا تھا، مگر اُنھوں نے یہاں ٹھہرنا پسند نہیں کیا —— دونوں صورتوں میں عبارت ہر لحاظ سے مکمل ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ "مگر" اور "اِس کے باوجود" میں سے ایک ٹکڑا زائد ہے۔

○ —— "وہاں ایسی کوئی جگہ موجود نہیں کہ جہاں مسافر کسی سایہ دار درخت کی چھاؤں میں بیٹھ سکے" —— اِسی مرکب جملے کو اِس طرح لکھ کر دیکھیے: وہاں ایسی کوئی جگہ نہیں جہاں مسافر کسی سایہ دار درخت... —— بات بھی مکمل ہو گئی اور بیان کے لحاظ سے عبارت بھی بہتر ہو گئی۔ اب

معلوم ہوا کہ پہلے جملے میں "کہ" اور "موجود نہیں" دو ٹکڑے زائد تھے۔ اِن سے اصل مفہوم میں کسی طرح کا اضافہ نہیں ہوا تھا۔ اِن کے نکال دینے سے اصل مفہوم میں کسی طرح کی کمی نہیں ہوئی۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ بیان کے لحاظ سے یہ جملہ پہلے جملے کے مقابلے میں بہتر ہو گیا۔
"سایہ دار درخت کی چھاؤں" سے مجھے اردو کے مشہور شاعر حفیظ جون پوری کا یہ شعر بے ساختہ یاد آ گیا:

بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے
ہائے کیا چیز غریبُ الوطَنی ہوتی ہے

کیسی سچّی بات کہی ہے اور کیسے اچھے ڈھنگ سے کہی ہے۔

○ —— "محمود وہاں گئے تو ہیں، لیکن دیکھیے کیا ہوتا ہے"۔ قواعد کے مطابق اِس جملے میں کوئی عیب نہیں۔ اچھا، اب اِسے اِس طرح لکھ کر دیکھیے: محمود وہاں گئے تو ہیں، دیکھیے کیا ہوتا ہے —— مفہوم میں کمی نہیں ہوئی۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ ایسے جملوں میں "لیکن" نہ لکھا جائے تب بھی جملہ ہر لحاظ سے مکمل رہے گا۔
مگر، لیکن، اگر، چوں کہ، کہ، اگرچہ؛ یہ سب کام کے لفظ ہیں۔ مرکّب جملوں میں اِن کی ضرورت پڑتی ہے۔ بعض دفعہ اِن کے بغیر مرکّب جملے میں ربط پیدا نہیں ہو پاتا۔ اِس کے ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ کبھی کبھی اِن کے بغیر جملہ مکمل ہو سکتا ہے۔ ایسی صورت میں اِن کو شامل کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ ضروری ہے کہ یہ دونوں پہلو لکھنے والے کی نظر میں رہیں۔

○ —— "یہ مانا کہ آپ وہاں نہیں جائیں گے"۔ اِس جملے میں قواعد کے لحاظ سے کوئی عیب نہیں، اِس کے باوجود اِس میں سے "کہ" نکل سکتا ہے: یہ مانا آپ وہاں نہیں جائیں گے۔ بات مکمل ہے، کسی طرح کی کمی پیدا نہیں ہوئی، البتہ بیان کی خوبی کچھ بڑھ گئی۔

○ —— "غرضیکہ وہ سب لوگ دوبارہ وہیں چلے گئے"۔ "غرضیکہ" لکھنے کی مطلق ضرورت نہیں۔ "غرض کہ" کافی ہے۔ اِس کی جگہ "الغرض"

بھی لکھا جاتا ہے، مگر اُس میں عربی پن زیادہ ہے۔ "غرض کہ" مناسب ٹکڑا ہے۔

○ —— اِسی انداز کا ایک مرکّب لفظ "گویا کہ" ہے۔ لوگ لکھتے ہیں، صرف "گویا" لکھا جائے، تب بھی مفہوم پوری طرح ادا ہو جائے گا اور قواعد کے لحاظ سے کوئی خرابی پیدا نہیں ہوگی۔

○ —— "یعنی کہ" کبھی کبھی دیکھنے اور سُننے میں آجایا کرتا ہے۔ اِس میں "کہ" زائد ہے، "یعنی" کافی ہے۔

○ —— ایک مشہور لکھنے والے نے لکھا تھا: "حال آنکہ اُنھیں شائع ہوئے ڈیڑھ صدی سے زیادہ کا زمانہ گزر چکا ہے۔" "زیادہ کا زمانہ" میں "کا" زائد ہے۔ "ڈیڑھ صدی سے زیادہ زمانہ گزر چکا ہے" لکھنا بہتر ہوتا۔

○ —— "اب تم کدھر کو جاؤ گے"۔ پہلی ہی نظر میں معلوم ہو سکتا ہے کہ "کدھر کو" میں "کو" زائد ہے۔ "اب تم کدھر جاؤ گے" بہتر اندازِ بیان ہوگا۔

○ —— "وہ اُدھر کو گئے ہیں" — اِس میں بھی "کو" زائد ہے۔ "وہ اُدھر گئے ہیں" لکھنا مناسب ہے۔

یہاں ایک بات کی وضاحت کر دی جائے۔ اُدھر کو، اِدھر کو، جدھر کو، کدھر کو استعمال میں آئے ہیں، شاعروں کے یہاں خاص طور پر۔ مثلاً مولانا حالی کا مشہور مصرع ہے: چلو تم اُدھر کو، ہوا ہو جدھر کی — اِس بنا پر ہم اِن لفظوں کو غلط نہیں کہیں گے، البتّہ یہ ضرور کہیں گے کہ نثر میں شاعروں کی پیروی نہیں کرنا چاہیے۔ شاعروں کو تو بہت سی آزادیاں حاصل ہوتی ہیں۔ ہم اُن پر اعتراض نہیں کریں گے، لیکن جب ہم نثر لکھیں گے تو خیال رکھیں گے کہ زائد لفظ جملے میں نہ آنے پائیں۔ اِس وجہ سے ہم "اُدھر کو" نہیں لکھیں گے، صرف "اُدھر" لکھیں گے۔ اِسی طرح جدھر اور کدھر۔

○ —— "اگرچہ" صحیح لفظ ہے، استعمال میں آتا ہے۔ بعض لوگ یہ غضب کرتے ہیں کہ "اگرچہ کہ" لکھتے ہیں۔ "اگرچہ" کافی ہے۔ "کہ" بے ضرورت ہے، اُس کی گنجایش ہی نہیں۔

ہاں "بہ شرطے کہ" ٹھیک ہے، اِسے بلا تکلف لکھا جا سکتا ہے۔ لکھا بھی جاتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اِس میں فارسی پن نمایاں ہے۔ آپ اگر اپنی نثر میں اِس کی جگہ "شرط یہ ہے" لکھیں تو بہتر ہوگا۔ شروع میں بھاری بھرکم لفظوں سے ممکن حد تک بچنا چاہیے: مثلاً: میں آجاؤں گا، شرط یہ ہے کہ آپ بھی صحیح وقت پر آنے کا وعدہ کریں۔

○ —— "اُنھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر تم نہیں آؤ گے، تو بنا بنایا کام بگڑ جائے گا" — اِس جملے میں دو لفظ "کہ اگر" ایک ساتھ آئے ہیں۔ اِن کا ساتھ ساتھ آنا قواعد کے لحاظ سے غلط نہیں؛ لیکن ایسے اکثر جملوں میں محسوس یہی ہوتا ہے کہ اچھا ہوتا اگر یہ دونوں اِس طرح ایک ساتھ نہ آتے — حُسنِ بیان کے لحاظ سے مناسب یہی ہوگا کہ "اگر" اور "کہ" ساتھ ساتھ نہ آئیں۔ مثلاً اِس جملے کو یوں بھی لکھا جا سکتا ہے: اُنھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ تم اگر نہیں آؤ گے . . . . — ایک لفظ کے بیچ میں آجانے سے بیان پہلے سے بہتر ہو گیا۔

اب اِس جملے کو دیکھیے: "وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اِس دفعہ فیل ہو گیا تو بہت رُسوائی ہوگی" — یہاں بھی وہی بات ہے۔ اِسے یوں لکھا جا سکتا ہے: وہ سوچ رہا تھا کہ اِس بار بھی اگر فیل ہو گیا تو . . . . . .

اب ایک اور بات: اِس جملے میں "اگر" نہ لکھیں تب بھی کوئی کمی نہیں محسوس ہوگی، یعنی: وہ سوچ رہا تھا کہ اِس دفعہ بھی فیل ہو گیا تو بہت رُسوائی ہوگی —— اِس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ایسے جملے بھی ہوتے ہیں جن میں "کہ" کے ساتھ یا جملے میں کسی اور جگہ "اگر" لکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بہتر یہی ہوگا کہ ایسے جملوں میں "اگر" نہ لکھا جائے۔

آپ اِن دونوں جملوں کو ایک بار نظر جما کر پڑھیے۔ آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ پہلے جملے کا انداز کچھ ایسا ہے کہ اُس میں "اگر" سے بیان میں زور بڑھ جاتا ہے،

یوں اُس جملے میں "اگر" لکھنا ضروری ہے۔ اِس کے برخلاف، دوسرا جملہ ایسا ہے کہ اُس میں سے "اگر" کو بہ آسانی کم کیا جا سکتا ہے۔ ادائے مطلب پر ذرا بھی اثر نہیں پڑے گا، البتّہ بیان کا حُسن بڑھ جائے گا۔ ایسے جملے لکھتے وقت اِس پہلو پر بھی نظر رکھنا چاہیے۔

○ —— ایک صاحب نے خط میں لکھا تھا: "آپ نے پھر تقاضہ کیا اور دھمکی بھی دی ہے، دراں حالیکہ میں پچھلے ہفتے آپ سے کہہ چکا ہوں کہ بہت جلد وہ رقم آپ کے پاس پہنچ جائے گی۔"

اِس عبارت میں "دراں حالیکہ" کس قدر بھاری بھرکم لفظ ہے! اِس کی جگہ "حالاں کہ" لکھا جا سکتا تھا۔ "دراں حالیکہ" اور "غرضیکہ" ایک ہی انداز کے لفظ ہیں۔ اِن کی جگہ "غرض کہ" اور "حالاں کہ" لکھنا چاہیے۔ اوپر جو عبارت نقل کی گئی، اُس میں ایک غلطی املا کی ہے۔ "تقاضہ" لکھا گیا ہے، لیکن اِس لفظ کا صحیح املا "تقاضا" ہے۔ ایسے کئی لفظ ہیں جن کے آخر میں الف ہے، مگر غلطی سے اُن کے آخر میں ہ لکھ دی جاتی ہے۔ اِن کا مفصّل بیان املا کے حصّے میں ملے گا۔

○ —— لفظوں کی غیر ضروری تکرار بڑا عیب ہے، اِس سے بچنا چاہیے۔ مثال کے طور پر اِس جملے کو دیکھیے: "میں نے کہا ضرور تھا کہ میں تمھارے ساتھ چلوں گا، لیکن میں کیا کرتا، مجھے فرصت ہی نہیں ملی۔"

اِسے اِس طرح لکھ کر دیکھیے: میں نے کہا ضرور تھا کہ تمھارے ساتھ چلوں گا، لیکن کیا کرتا، فرصت ہی نہیں ملی۔ دو جگہ "میں" اور ایک جگہ "مجھے"، یہ تینوں لفظ غیر ضروری ہیں، یعنی زائد ہیں۔ یہ معلوم ہے کہ ایسے زائد لفظ عبارت کے حُسن کو تباہ کر دیتے ہیں۔ اچھی عبارت وہ ہے جس میں لفظی کفایت شعاری سے کام لیا گیا ہو۔ زائد لفظ نہ ہوں، غیر ضروری طور پر لفظوں کی تکرار نہ ہو اور ممکن حد تک ایسے لفظ نہ ہوں جنھیں عربی فارسی کے بھاری بھرکم لفظ کہا جا سکے۔ نیز غیر ضروری انگریزی لفظوں کے بے جوڑ پیوند نہ لگائے گئے ہوں۔

○

○ —— "تم کبھی بھی اِس کام کو مکمّل نہیں کر سکو گے"۔ اِس جملے میں کوئی خرابی ہے؟ غور سے دیکھیے۔ اچھا اِسی جملے کو اِس طرح لکھ کر دیکھیے: تم کبھی اِس کام کو مکمّل نہیں کر سکو گے۔ بات پوری ہو گئی نا! معلوم یہ ہوا کہ "کبھی بھی" کی جگہ "کبھی" لکھنا کافی تھا۔ "بھی" زائد ہے۔ اصل مفہوم سے اِس لفظ کا کچھ تعلّق نہیں۔ اِس کے علاوہ "کبھی بھی" بولنے میں کتنا بُرا لگتا ہے!

○ —— "تم ابھی بھی نہیں سمجھ پائے کہ اُن کا ارادہ کیا ہے"؟ اِس جملے میں "ابھی بھی" کی جگہ "اب بھی" لکھ کر دیکھیے، آپ محسوس کریں گے کہ اندازِ بیان کے لحاظ سے جملہ بہتر ہو گیا ہے۔ "کبھی بھی" کی طرح "ابھی بھی" کو بھی عبارت میں شامل نہ ہونے دیجیے۔ تلفّظ کے لحاظ سے "ابھی بھی" کے مقابلے میں "اب بھی" سبک اور رواں ہے۔

○ —— "اِس کے باوجود بھی تم اُن کی تعریف کر رہے ہو"۔ "بھی" یہاں بھی زائد ہے۔ "اِس کے باوجود تم اُن کی تعریف کر رہے ہو" لکھنا چاہیے تھا۔ یاد رکھیے کہ "اِس کے باوجود" کے بعد "بھی" لکھنے کی ضرورت نہیں۔

○ —— ایک صاحب نے لکھا تھا: "اِس کے علاوہ بھی بہت سی چیزیں وہاں تھیں"۔ اِس جملے میں "اِس کے علاوہ بھی" کس قدر بھدّا معلوم ہوتا ہے! "اِس کے علاوہ اور بہت سی چیزیں وہاں تھیں" لکھا جا سکتا تھا۔ یوں بھی لکھ سکتے تھے: "اِس کے علاوہ اور بھی چیزیں وہاں تھیں"۔ مطلب یہ ہے کہ "بھی" اور "اِس کے علاوہ" کو ایک ساتھ نہیں لانا چاہیے۔

○

"صرف" اور "ہی" ایسے لفظ ہیں جو ایک ہی مفہوم کو ادا کرتے ہیں۔

ذرا دیر کے لیے مان لیجیے کہ جملہ اِس طرح لکھا گیا: "صرف میں ہی اِس کام کو انجام دے سکتا ہوں"۔ اِس میں "صرف" اور "ہی" میں سے ایک لفظ زائد ہے۔ اِس جملے کو یوں لکھ کر دیکھیے: "میں ہی اِس کام کو انجام دے سکتا ہوں"۔ بات مکمل ہوگئی نا! یا مثلاً یہ جملہ: "صرف نئی تعلیم ہی سماجی شعور پیدا کر سکتی ہے"۔ اِس جملے کو اگر یوں لکھا جاتا: "صرف نئی تعلیم سماجی شعور پیدا کر سکتی ہے"، تب بھی بات مکمل ہو جاتی اور تکرار کا عیب پیدا نہ ہوتا۔ "صرف میں ہی" لکھنا ایسا ہی ہے جیسے کہا جائے سنلائٹ سوپ صابن، یا شبِ قدر کی رات۔

"صرف" اور "ہی"، اِن کو ایک ساتھ نہ لائیے۔ یا تو "صرف" لکھیے یا "ہی" لکھیے۔ اکثر صورتوں میں یہ دیکھا گیا ہے کہ "ہی" بہتر معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً یہ جملہ: "اب تو صرف خدا مدد کر سکتا ہے"۔ اِسے اگر اِس طرح لکھا جائے: "اب تو خدا ہی مدد کر سکتا ہے"، تو صاف طور پر محسوس ہوگا کہ حُسنِ بیان اور زورِ بیان، دونوں کے لحاظ سے جملہ بہتر اور پُرزور ہو گیا ہے۔

○ —— "فقط میں ہی نہیں گیا"۔ اِس جملے میں بھی وہی عیب ہے۔ "فقط" اور "ہی" ایک ہی مفہوم کو ظاہر کرتے ہیں۔ "میں ہی نہیں گیا" لکھنا کافی تھا۔ جس طرح "صرف" کے ساتھ "ہی" کو جمع نہیں کرنا چاہیے، اُسی طرح "فقط" اور "ہی" کو بھی ایک ساتھ نہیں لانا چاہیے۔

○ —— ایک صاحب نے اپنے مضمون میں لکھا تھا: "یہ تبدیلیاں صرف بمبئی ہی تک محدود نہیں تھیں"۔ —— اِس جملے میں "صرف" اور "ہی" میں سے ایک لفظ زائد ہے۔ اِس سے مفہوم میں کچھ اضافہ نہیں ہوا، البتہ بیان کا حُسن کم ہو گیا، بل کہ یوں کہیے کہ بگڑ گیا۔ "یہ تبدیلیاں بمبئی تک محدود نہیں تھیں"، لکھا جا سکتا تھا۔

○ —— "نہ تم وہاں گئے، نہ ہی وہ یہاں آئے"۔ "نہ تم بات سُنتے ہو، نہ ہی وہ اِس طرف توجہ کرتے ہیں"۔ —— دونوں جملوں میں "ہی"

زائد ہے۔ اِس سے جملوں میں بھدّا پن پیدا ہو گیا ہے۔ "نہ ہی" کے بجائے صرف "نہ" لکھنا چاہیے تھا: نہ تم وہاں گئے، نہ وہ یہاں آئے۔ نہ تم بات سُنتے ہو، نہ وہ اِس طرف توجہ کرتے ہیں۔

○ —— اِس جملے کو دیکھیے: "یہ صرف دہلی ہی سے مخصوص نہیں ہے"۔ اِس ایک جملے میں صرف، ہی، مخصوص؛ یہ تین لفظ ایسے ہیں جو ایک ہی مفہوم کو ادا کر رہے ہیں۔ اگر اِسے یوں لکھا جاتا: "یہ دہلی سے مخصوص نہیں"، تو دو زائد لفظ عبارت میں شامل نہ ہو پاتے۔ اِس کے ساتھ ساتھ "نہیں ہے" میں سے بھی ایک لفظ کم ہو جاتا۔ مفہوم اور حُسنِ بیان، دونوں کے لحاظ سے اِس جملے میں "نہیں" کے ساتھ "ہے" لانے کی ضرورت نہیں۔ ایک چھوٹے سے مفرد جملے میں سے تین لفظ بہ آسانی کم کر دیے گئے۔ معنی مطلب میں ذرا سا بھی فرق نہیں پڑا، ذرا سی بھی کمی نہیں ہوئی، ہاں یہ ضرور ہوا کہ بندش کی چُستی بڑھ گئی اور بیان کا حُسن بھی بڑھ گیا۔

○

"ہی" کے متعلق ایک ضروری بات سمجھ لیجیے۔ یہ قاعدہ ہے کہ "ہی" کا تعلق جس لفظ سے ہوگا، یہ اُسی کے ساتھ آئے گا۔ اِن دونوں کے درمیان کوئی اور لفظ نہیں آئے گا۔ مثال کے طور پر اِس جملے کو دیکھیے: "یہ خط ڈاکٹر صاحب کے ہی ہاتھ میں دینا"۔ اِس جملے میں "ہی" کا تعلق "ڈاکٹر صاحب" سے ہے، اِس لیے یوں لکھنا چاہیے تھا: یہ خط ڈاکٹر صاحب ہی کے ہاتھ میں دینا۔ "کے" نے بیچ میں آکر جملے کو خراب کر دیا۔

"وہ دہلی میں ہی ملازمت ڈھونڈیں گے"۔ اِس جملے میں "ہی" کا تعلق "دہلی" سے ہے، اِس طرح لکھنا چاہیے تھا: وہ دہلی ہی میں ملازمت ڈھونڈیں گے۔

ایک صاحب نے تلفّظ پر بحث کرتے ہوئے لکھا تھا: "اُن الفاظ میں ہی تلفّظ کی تبدیلیاں ظاہر ہوتی ہیں جو استعمال میں زیادہ آتے ہیں"۔ —— بات تو ٹھیک ہے، مگر اندازِ بیان اچھا نہیں۔ "اُن الفاظ میں ہی"، کس قدر

سخت ٹکڑا ہے۔ روانی نام کو نہیں ──── اچھّا اب اسے یوں لکھیے :
"اُنھی الفاظ میں تلفّظ کی تبدیلیاں ظاہر ہوتی ہیں۔ ۔ ۔ ۔"
اب ذرا اِن دونوں ٹکڑوں کو دو تین دفعہ پڑھیے۔ آپ خود محسوس کرلیں گے کہ "اُن الفاظ میں ہی" کے مقابلے میں "اُنھی الفاظ میں" روانی زیادہ ہے اور بیان کا حُسن بھی ہے۔ اِس سے معلوم ہوا کہ "اُن ہی" کے بجائے "اُنھی" لکھنا بہتر ہے۔
"اُنھی" اصلاً مرکّب لفظ ہے۔ یہ "اُن" اور "ہی" سے مل کر بنا ہے۔ "ہی" میں شوشے دار ہ ہے، جسے ہائے ہوّز بھی کہتے ہیں۔ "اُنھی" میں یہی ہ، دوچشمی ھ میں بدل گئی۔ اِس طرح تلفّظ آسان ہوگیا۔ "ان ہی" میں ہ کی آواز الگ سے نکلتی ہے۔ "اُنھی" میں نون کی آواز ھ میں مل جاتی ہے اور اِس طرح دو حرفوں کی الگ الگ آوازیں ایک بن جاتی ہیں۔ اِس طرح تلفّظ کے لحاظ سے اِس میں سبک پن پیدا ہوجاتا ہے اور روانی آجاتی ہے۔

○ ──── ذرا اِس مرکّب جملے کو دیکھیے : "اِس وقت ہم اُس ہی شخص کے متعلّق بات کریں گے جو کل آیا تھا" ──── آپ اِسے یوں لکھ کر دیکھیے : "اِس وقت ہم اُسی شخص سے متعلّق باتیں کریں گے۔۔۔۔"
آپ بہ خوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ جملہ، پہلے والے جملے سے بہتر ہے۔ وجہ بس یہی ہے کہ "اُس ہی" کے بجائے "اُسی" لکھا گیا ہے۔
اِس ہی، اُس ہی، اُن ہی، اِن ہی، وہ ہی، یہ ہی، سب ہی، جب ہی، تب ہی؛ ──── اِن کی جگہ اِسی، اُسی، اِنھی، اُنھی، وُہی، یہی، سبھی، جبھی، تبھی بہتر معلوم ہوں گے۔ اِس کا خیال رکھیے کہ جملوں میں اِنھی سے کام لیا جائے۔
میں نے ایک بار خط میں لکھا تھا : "پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ وہ ہی کتاب بھیج دیجیے"۔ جن صاحب کو خط لکھا تھا، اُنھوں نے کتاب فوراً بھیج دی۔ ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ جناب! "وہ ہی کتاب" لکھنا آپ

نے کس سے سیکھا ہے؟ میں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ اُن کی بات ٹھیک ہے۔ "وہی کتاب" لکھنا چاہیے تھا۔ "وہ ہی" اور "یہ ہی" غلط نہیں، مگر اچھا یہی ہے کہ اِن کی جگہ "وہی" اور "یہی" لکھیں۔

○

جملوں میں زائد لفظ طرح طرح سے آجایا کرتے ہیں۔ یوں اِس طرف توجّہ کرنے کی خاص طور پر ضرورت ہے۔ مثلاً اِس جملے پر نظر ڈالیے : "ہم اُن کے ساتھ میں بازار گئے تھے"۔ "میں" کی یہاں کچھ ضرورت نہیں۔ یا جیسے یہ جملہ : "وہ اُنھی دنوں میں گھر گئے تھے"۔ یہاں بھی "میں" زائد ہے۔ "وہ اُنھی دنوں گھر گئے تھے" کافی ہے۔
○ ──── "وہ شام میں آئے تھے"۔ یہ اندازِ بیان غیر مناسب ہے، نرا انگریزی کا ترجمہ معلوم ہوتا ہے۔ "وہ شام کو آئے تھے" لکھا جاسکتا تھا۔ "شام کے وقت" بھی لکھ سکتے تھے۔
"شام میں" اور "صبح میں"، انگریزی کے ایسے ترجمے ہیں جو اُردو کے اندازِ بیان سے میل نہیں کھاتے۔ اُردو والے "شام کے وقت" یا "صبح کے وقت" کہتے ہیں۔ "شام کو" بھی لکھتے ہیں۔
یہاں ایک بات خاص طور سے سمجھ لینا چاہیے۔ لفظوں کے استعمال میں قیاس ساتھ نہیں دیتا۔ مثلاً ہم سب "رات میں" اور "دن میں" لکھتے بھی ہیں اور بولتے بھی ہیں۔ جیسے : "رات میں ستارے آسمان پر چمکتے ہیں"۔ اِس سے یہ لازم نہیں آتا کہ "شام میں" یا "صبح میں" بھی درست ہو۔ اُردو میں روزمرّہ کی اصل حیثیت ہے اور اُردو کے روزمرّہ کے لحاظ سے "شام میں" یا "صبح میں" لکھنا یا بولنا نامناسب ہے۔
○ ──── "وہ پاس میں بیٹھے ہوئے تھے" ──── یہ بھی مناسب اندازِ بیان نہیں۔ یہاں "میں" زائد ہے۔ "وہ پاس بیٹھے ہوئے تھے" کافی ہے۔ تاکید سے کام لینا ہو، یعنی زور دینا ہو تو یوں لکھ سکتے ہیں :

"وہ پاس ہی بیٹھے ہوئے تھے"۔

○ ——— "وہ دیر میں آئے تھے"۔ اسے اگر یوں لکھا جائے: "وہ دیر سے آئے تھے"، تو مناسب اندازِ بیان ہوگا۔

"وہ سب کے بعد میں گئے تھے"۔ یہاں "میں"، زائد ہے۔ "وہ سب کے بعد گئے تھے"، مکمل جملہ ہے۔ ذرا سی توجہ سے کام لیا جائے تو ذہن خود بتا دے گا کہ "میں"، کہاں زائد ہے اور کہاں غیر مناسب نہیں۔

○ ——— کوئی صاحب سو کر نہ اُٹھے ہوں، یا یوں ہی لیٹے ہوئے ہوں، اُن کے لیے یہ کہنا کہ "وہ اب تک بستر میں ہیں"، یا یہ کہ "میں گیا تو وہ بستر میں تھے"، مناسب اندازِ بیان نہیں۔ یہ بھی انگریزی کے اندازِ بیان کا ایسا ترجمہ ہے جو اُردو زبان کے انداز سے میل نہیں کھاتا، صاف طور پر بے جوڑ معلوم ہوتا ہے۔ وہ لیٹے ہوئے تھے، وہ سو رہے تھے لکھا جا سکتا تھا۔ "بستر میں"، اُردو کا اندازِ بیان نہیں۔

○

"میں پہلے تو تخت کے اوپر بیٹھا، پھر کُرسی کے اوپر بیٹھ گیا"۔ — اِس عبارت میں "تخت کے اوپر"، اور "کرسی کے اوپر"، کی جگہ اگر "تخت پر" اور "کرسی پر"، لکھا جاتا تو بہتر ہوتا۔

جگہ پر، کہیں پر، کہاں پر، جہاں پر، وہاں پر، یہاں پر، کہیں پر، وہیں پر، ! یہ کلمے استعمال میں آ گئے ہیں اور استعمال میں آتے ہیں۔ اِس کے باوجود اچھا یہی ہوگا کہ اِن میں "پر"، کو شامل نہ کیا جائے۔ جو مطلب "وہاں پر"، سے ادا ہوتا ہے، وہی مطلب "وہاں سے"، ادا ہوجاتا ہے۔ "ہم وہیں پر بیٹھے تھے"۔ اِس جملے کو اگر یوں لکھا جائے: "ہم وہیں بیٹھے تھے"، تو مطلب پوری طرح ادا ہوجاتا ہے اور اچھی طرح۔

یا جیسے کہا جائے: "اِس جگہ پر یہ بات سمجھ میں آتی ہے"۔ اِسی جملے کو اگر ہم اِس طرح لکھیں: "اِس جگہ یہ بات سمجھ میں آتی ہے"، تب بھی

بات مکمل ہوجاتی ہے۔ اِس سے صاف طور پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ ایسے ٹکڑوں میں عام طور سے "پر"، زائد ہوتا ہے۔

عبارت میں قواعد کے لحاظ سے کوئی عیب نہ ہو، یہ اچھی بات ہے۔ زیادہ اچھی بات یہ ہے کہ عبارت میں حُسن بھی ہو۔ زائد ٹکڑے جملے میں آجاتے ہیں، تو عبارت کا حُسن کم ہوجاتا ہے اور کبھی ختم ہوجاتا ہے۔

ہاں، یہ وضاحت کر دی جائے کہ "اِس بات پر"، "اِس موقعے پر"، "اِس منزل پر"، جیسے ٹکڑے بالکل ٹھیک ہیں۔ اِن میں کوئی عیب نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اِن میں "پر"، زائد نہیں۔ اِس کی دلیل یہ ہے کہ "پر"، کے بغیر مفہوم مکمل نہیں ہوگا، جملہ بھی مکمل نہیں ہوگا ——— "جہاں پر بیٹھے تھے"، اِس میں سے "پر"، کو نکال دیجیے، تب بھی جملہ مکمل رہے گا، بل کہ بہتر ہوجائے گا۔ یہ پہچان ہے اِس کی کہ یہاں یہ لفظ زائد ہے۔ اِس کے مقابلے میں اِس جملے کو دیکھیے: "اِس بات پر ہنسی آتی ہے"۔ اِس میں "پر"، نہ لکھا جائے تو جملہ مکمل نہیں ہوگا۔ اِس سے معلوم ہوا کہ یہاں یہ لفظ زائد نہیں۔

ہم جب بھی کچھ لکھیں، ہمیں اُسے بار بار پڑھنا چاہیے اور غور کرنا چاہیے کہ جملوں میں کچھ لفظ زائد تو نہیں۔ اِسی طرح یہ بھی دیکھ لیا جائے کہ عبارت میں کوئی جملہ یا جملے زائد تو نہیں۔ اِس کی عادت ڈال لی جائے تو اکثر صورتوں میں تحریر زائد ٹکڑوں سے محفوظ رہ سکتی ہے۔

ایک بات اور: پُرانی تحریروں میں ایسے جملے یا عبارتیں سامنے آئیں جن میں زائد لفظ یا زائد جملے ہوں، تو اُن کو پُرانی بات سمجھ کر نظر انداز کر دینا چاہیے۔ اچھی نثر لکھیے۔ بُری نثر کسی کی بھی ہو، نئے لکھنے والے کی یا پُرانے بزرگوں کی، اُس کو مثال نہ بنائیے۔ کیا آج کل لوگ بُری نثر نہیں لکھتے؟ لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں۔ اُردو کے ممتاز افسانہ نگار انتظار حسین نے حال ہی میں ایک انٹرویو کے دوران کہا تھا: "نثر اِس زمانے میں بہت خراب لکھی جا رہی ہے اور مجھ سے وہ افسانہ نہیں پڑھا جاتا جو خراب نثر میں لکھا گیا ہو۔ . . . . . پھر جب نثر اچھی نہیں لکھی گئی ہے تو افسانہ کیسے اچھا لکھا

جائے گا،، (ماہ نامہ آجکل، فروری ۱۹۹۲ء)

○

جب نام سے پہلے "ڈاکٹر" یا "پروفیسر" لکھ دیا، تو پھر نام کے بعد "صاحب" لکھنے کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح جب نام سے پہلے "جناب" لکھ دیا، تو پھر نام کے بعد "صاحب" لکھنے کی ضرورت نہیں۔ اگر نام کے بعد "صاحب" لکھا ہے، تو پھر نام سے پہلے "جناب" لکھنا ضروری نہیں۔ ضروری کیا، مناسب بھی نہیں۔ جناب اڈیٹر صاحب، جناب ڈاکٹر صاحب، جناب پرنسپل صاحب، جناب رام لال صاحب، جناب محمود الٰہی صاحب؛ اِن سب ٹکڑوں میں "جناب" اور "صاحب" میں سے ایک لفظ زائد ہے۔

کس جگہ نام سے پہلے "جناب" لکھا جائے اور کہاں نام کے بعد "صاحب" لکھا جائے، اِس کا تعلّق اِس سے ہے کہ وہاں کون سا لفظ مناسب ہوگا۔ مثلاً "جناب پرنسپل" اور "پرنسپل صاحب" میں آخری ٹکڑا بہتر ہے۔ اِسی طرح بھائی صاحب، مولوی صاحب، اڈیٹر صاحب لکھنا چاہیے۔

خاص ناموں سے پہلے "جناب" لکھنا بہتر ہوسکتا ہے۔ مختصر یہ کہ ایک نام کے ساتھ "جناب" اور "صاحب" کو جمع نہ کیجیے۔ "جناب محمد حسین خاں" لکھیے، یا "محمد حسین خاں صاحب"۔ جناب محمد حسین خاں صاحب مناسب نہیں۔ اِسی طرح مثلاً پروفیسر آلِ احمد سرور۔ اگر "پروفیسر آلِ احمد سرور صاحب" لکھا جائے، تو کہا جائے گا کہ یہاں "پروفیسر" اور "صاحب" میں سے ایک لفظ زائد ہے۔ اگر کسی نے "جناب پروفیسر آلِ احمد سرور صاحب" لکھا ہے، تو کہا جائے گا کہ جناب، پروفیسر اور صاحب اِن تینوں لفظوں میں سے دو لفظ زائد ہیں۔

اِسی طرح جب نام سے پہلے "شری" لکھ دیا تو پھر آخر میں "صاحب" لکھنا ضروری نہیں۔ جیسے: شری موہن لال اگروال۔ اِسے اگر "شری موہن لال اگروال صاحب" لکھا جائے تو کہا جائے گا کہ یہاں "شری" اور "صاحب"

میں سے ایک لفظ زائد ہے۔

بہت سے ناموں کے ساتھ اسمِ نسبت بھی شامل ہوتے ہیں، جیسے: فراق گورکھ پوری، جگر مرادآبادی، ظہیر احمد صدّیقی، شمس الرحمان فاروقی، صدیق الرحمان قدوائی۔ ایسے ناموں سے پہلے "جناب" لکھنا مناسب ہوگا۔ جیسے: جناب شمس الرحمان فاروقی۔

اگر کسی وجہ سے آخر میں "صاحب" لکھنا پڑے، تو پھر اُسے آخر میں لکھنا چاہیے، جیسے: ظہیر احمد صدّیقی صاحب، مخمور سعیدی صاحب۔ "صاحب" کو بیچ میں نہیں آنا چاہیے، یعنی "ظہیر احمد صاحب صدّیقی" لکھنا مناسب نہیں۔

اب سے پہلے خطوں میں لمبے چوڑے القاب آداب لکھے جاتے تھے، اُسی طرح "صاحب" اور "جناب" کو بھی ساتھ ساتھ لایا جاتا تھا۔ اب وہ روشیں بدل گئیں، وہ انداز باقی نہیں رہے۔ رات گئی، بات گئی۔ اب لفظی کفایت شعاری کا بھی لحاظ رکھا جاتا ہے۔ مہذّب آدمی کی طرح لفظوں کو بھی دیکھ بھال کر اور سوچ سمجھ کر استعمال کیجیے۔ جھگڑالو مردوں اور لڑاکا عورتوں کی طرح لفظوں کو بے دردی کے ساتھ صرف میں نہ لائیے۔ فضول خرچی کرنے والوں کو "شیطان کا بھائی" کہا گیا ہے۔ لفظوں کی قدر و قیمت تو روپوں سے کہیں زیادہ ہے، اِس صورت میں لفظوں کی فضول خرچی کرنے والوں کو کیا کہا جائے گا؟

○

لفظوں کے انتخاب میں بہت احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ جملے میں جتنے لفظ لکھے جائیں، ہر لفظ کے متعلّق ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ (۱) اُس کا املا کیا ہے (۲) معنی کیا ہیں۔ معنی کے ساتھ ساتھ یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اُس لفظ کو جملے میں کس جگہ اور کس ڈھنگ سے لانا چاہیے۔ یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اُس لفظ کا صحیح تلفّظ کیا ہے۔ عبارت تو پڑھنے کے لیے لکھی جاتی ہے۔ اگر کوئی لکھنے والا اپنی لکھی ہوئی عبارت میں لفظوں

کو صحیح طور پر نہ پڑھ پائے، تو یہ بڑے شرم کی بات ہوگی۔

جن لفظوں کے معنی معلوم نہ ہوں، یا کچھ شک ہو، اُن کو جملے میں نہیں لکھنا چاہیے۔ لغت میں دیکھ لینا چاہیے، یا اُستادِ محترم سے پوچھ لینا چاہیے۔ جب اطمینان ہو جائے، تب لکھنا چاہیے۔ اِس سلسلے میں احتیاط نہ کرنے سے بعض دفعہ بڑی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

مجھے ایک واقعہ یاد آگیا۔ ایک صاحب اپنے مضمون میں یہ لکھنا چاہتے تھے کہ فلاں صاحب کو بہت شہرت ملی۔ اِس مطلب کو ادا کرنے کے لیے اُنھوں نے لکھا: "اُن کی خوب تشہیر ہوئی"۔ یہ مضمون ایک محفل میں پڑھا گیا لوگوں نے "تشہیر" پر اعتراض کیا۔ اُن سے کہا گیا کہ اِس سے تو اُلٹا مطلب نکلتا ہے کہ وہ بہت رُسوا ہوئے، اُن کی بہت بدنامی ہوئی۔

اعتراض درست تھا۔ "تشہیر" کے معنی ہیں: رُسوا کرنا۔ پُرانے زمانے میں سزا دینے کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ مجرم کا مُنہ کالا کر کے، اُسے گدھے پر بٹھا کر، شہر کی گلیوں اور سڑکوں پر گھمایا جاتا تھا۔ اِس کو "تشہیر" کہتے تھے۔

مولانا محمد حسین آزاد نے اپنی کتاب دربارِ اکبری میں ایک واقعہ لکھا ہے:

"لشکر خاں میر بخشی ایک دن شراب پی کر دربار میں آیا اور بدمستیاں کرنے لگا۔ اکبر بہت خفا ہوا۔ گھوڑے کی دُم سے بندھوایا اور لشکر خاں کو لشکر میں تشہیر کیا۔ سب نشے ہرن ہو گئے"

(دربارِ اکبری صفحہ ۶)۔

اگر ہم اپنی عبارت میں شہرت کے معنی میں "تشہیر" لکھیں تو ہماری رُسوائی ہوگی۔ پڑھے لکھے لوگ کہیں گے کہ لکھنے والے کو اِس لفظ کے معنی نہیں معلوم۔

○ ـــــــ ایک لفظ ہے "بکواس"۔ فضول گفتگو کے مفہوم میں آتا ہے، جیسے: وہ تو بکواس کرتے ہی رہتے ہیں۔ "بکنا" مصدر ہے، اِسی سے "بکواس" بنا ہے۔ اگر کوئی صاحب مثلاً یہ لکھیں: "یہ فلم تو بکواس ہے"، تو ظاہر ہے کہ اِس لفظ کا یہ صحیح استعمال نہیں ہوگا۔ سیدھا سا جملہ لکھا

جا سکتا تھا: یہ فلم خراب ہے۔ فلم کی خرابی پر زور دینا مقصود ہو تو "بہت" کا لفظ بڑھا سکتے ہیں، مثلاً: یہ فلم تو بہت خراب ہے۔ "بکواس" کا یہاں کیا کام۔ "بکواس" کا تعلق اندازِ گفتگو سے ہے۔

فکر کے معنی میں "سوچ" بعض لوگ بولتے اور لکھتے ہیں، جیسے: میری سوچ کو وہ خوب سمجھتے ہیں۔ یہاں سوال یہ نہیں کہ یہ لفظ صحیح ہے یا غلط۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ لفظ اِس معنی میں مستعمل نہیں رہا، اِس لیے بہت اجنبی معلوم ہوتا ہے۔ یہ لفظ فکر کے معنی میں ابھی تک زبان میں گھل مِل نہیں سکا، اِس لیے غیر فصیح لگتا ہے۔ اچھا یہی ہے کہ اِسے فکر کے معنی میں استعمال نہ کیا جائے۔

○ ـــــــ "اب کے" اور "اب کی" دونوں لفظ صحیح اور مستعمل ہیں۔ یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ مفرد صورت میں "اب کے" لکھا جائے گا، جیسے: اب کے تم آؤ گے تو ہم بھی تمھارے ساتھ چلیں گے۔ اب کے گئے نہ جانے کب آؤ گے!

ع : اب کے بھی دن بہار کے یوں ہی گزر گئے
ع : اب کے بہار آئی تو سمجھو کہ ہم گئے

جب اِس کے بعد کوئی لفظ اِس سے متعلق ہو کر آئے گا، اُس صورت میں یہ دیکھا جائے گا کہ وہ لفظ مذکر ہے یا مونث۔ وہ لفظ اگر مذکر ہے تو اُس کے ساتھ "اب کے" آئے گا، جیسے: اب کے برس، اب کے سال۔

اگر وہ لفظ مونث ہے تو "اب کی" آئے گا، جیسے: اب کی بات۔ ایک مَثَل ہے: اب کی بات اب کے ساتھ، جب کی بات جب کے ساتھ۔

ایک ضمنی بات ـــــــ اوپر مثال کے طور پر "اب کے برس" بھی لکھا گیا ہے۔ اِس سلسلے میں صرف یہ کہنا ہے کہ "برس" مذکر ہے۔ "ایک برس گزر گیا" کہیں گے "ایک برس گزر گئی" نہیں لکھیں گے۔ اِس کی جمع "برسوں" بنے گی، جیسے: مرے گھر وہ آئے تھے برسوں کے بعد ـــــــ اِس کی جمع "برسیں" نہیں بنے گی۔ مثلاً "برسیں گزر گئیں" نہیں لکھیں گے

○ ـــــــ سبزا اور سبزہ، دونوں لفظ استعمال میں آتے ہیں۔ یہ

اسمِ صفت ہیں۔ قاعدہ یہ ہے کہ موصوف مذکّر ہوگا تو ”سنہرا“ لکھیں گے، جیسے: سنہرا پھول، سنہرا رنگ۔ ع : روپ بجلی کا سنہرا ہے، رُپہلا بادل۔
موصوف موٴنّث ہوگا تو ”سنہری“ لکھیں گے، جیسے: سنہری رنگت، سنہری جوتی۔
ع : تاکتا ہے تو ثریا کی سنہری بوتل۔

مصدر کے آخر میں ”نا“ ہوتا ہے، جسے علامتِ مصدر کہتے ہیں، جیسے: کرنا، سونا، جانا۔ جب مصدر کے ساتھ کوئی اسم آتا ہے، تب یہ ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ مصدر کو کس طرح لکھیں گے، مثلاً ”کتاب پڑھنا“ لکھیں گے یا ”کتاب پڑھنی“ کہیں گے؟ یہ کہا گیا ہے کہ اِس قاعدے میں دہلی اور لکھنؤ والوں کا اختلاف ہے۔ دہلی والے اسمِ موٴنّث کے ساتھ ”نی“ لاتے ہیں، جیسے: روٹی کھانی، بات کہنی، چائے پینی، رائے دینی، تصویر دیکھنی۔ اسم اگر مذکّر ہو تو ”نا“ لکھتے ہیں، جیسے: پانی پینا، پُلاؤ کھانا، قلم اُٹھانا، جواب دینا۔ لکھنؤ میں عام طور پر مصدر کی علامت میں تبدیلی نہیں کرتے۔ اسم مذکّر ہو یا موٴنّث، ہر صورت میں ”نا“ برقرار رہتا ہے، مثلاً: کتاب پڑھنا، رائے دینا، چائے پینا، پانی پینا، روٹی کھانا، بات کرنا، دعا کرنا، جادو جگانا۔
تہر گوالیاری، داغ دہلوی کے شاگرد تھے۔ ایک طرحی مشاعرے میں اُنھوں نے بھی غزل پڑھی۔ طرح کا جو مصرع تھا، اُس میں قافیہ تھا: نظر۔ اور ردیف تھی: ہونا۔ تہر کی غزل کا مقطع یہ تھا:

یہاں ہیں تہر! اہلِ لکھنؤ بھی، اہلِ دہلی بھی
یہ کہتے ہیں سحر ہونی، وہ کہتے ہیں سحر ہونا

یہ قاعدہ دہلی اور لکھنؤ کی نسبت کے ساتھ اِسی طرح عمل میں آتا رہا ہے، اِس لیے ہمارے لیے دونوں صورتیں درست اور صحیح ہیں، لیکن اچھا یہی ہوگا کہ کسی ایک طریقے کو مان لیا جائے اور اُس پر عمل کیا جائے۔ مثلاً کوئی صاحب ”کتاب پڑھنا“ یا ”رائے دینا“ لکھتے ہیں، تو اُن کے لیے یہ

مناسب نہیں ہوگا کہ وہ ایک جگہ تو ”کتاب پڑھنا“ لکھیں اور کسی دوسری جگہ ”چائے پینی“ یا ”دعا کرنی“ لکھیں۔ ایک ہی انداز کو اپنانا چاہیے۔

”نہیں“ کے ساتھ ”ہے“ یا ”ہیں“ لانا بہت سے مقامات پر اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ صاف صاف دکھائی دیتا ہے کہ ”ہے“ یا ”ہیں“ زائد لفظوں کی طرح آئے ہیں۔ مثلاً اِس جملے کو دیکھیے: ”وہ شخص اپنی دکان پر موجود نہیں ہے“، یہاں ”ہے“ بے کار نظر آتا ہے۔ اِس جملے کو اگر اِس طرح لکھا جاتا: ”وہ شخص اپنی دُکان پر موجود نہیں“، تو بات بھی مکمل ہو جاتی اور بیان کے لحاظ جملہ بہتر ہو جاتا۔ یا محض بہ طورِ مثال اِس عبارت کو دیکھیے: ”وہ کہیں آتے جاتے نہیں ہیں، دن بھر گھر میں بیٹھے رہتے ہیں“۔ اِسے اگر یوں لکھا جائے: ”وہ کہیں آتے جاتے نہیں، دن بھر گھر میں بیٹھے رہتے ہیں“، تو واضح طور پر معلوم ہوگا کہ یہ بہتر صورت ہے۔ پہلے جملے میں ”نہیں ہیں“ میں ”ہیں“ صاف طور پر زائد معلوم ہوتا ہے۔
یہ دیکھا گیا ہے کہ ”نہیں ہے“ یا ”نہیں ہیں“، یہ دونوں ٹکڑے بہت سے مقامات پر حسنِ بیان کے لحاظ سے غیر مناسب نظر آتے ہیں۔ جب بھی فعل کی اِس صورت کو استعمال کیا جائے تو یہ ضرور دیکھ لیا جائے کہ ادائے مطلب اور حسنِ عبارت کے اعتبار سے صورتِ حال کیا ہے۔ غور کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ اکثر مقامات پر ”نہیں“ اور ”ہے“ کا ساتھ ساتھ آنا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ مثلاً: ”کوئی شخص جان بوجھ کر نقصان اٹھانا گوارا نہیں کرتا ہے“۔ یہاں بھی ”ہے“ زائد معلوم ہوتا ہے۔ اِس کی بہتر صورت یہ ہو سکتی ہے: ”کوئی شخص جان بوجھ کر نقصان اٹھانا گوارا نہیں کرتا“۔ زائد لفظ عام طور پر عبارت کو بگاڑ دیا کرتے ہیں، ایسے مقامات پر ”ہے“ بھی یہی کیا کرتا ہے۔ ”نہیں ہیں“ میں بھی بہت سے مقامات پر یہی خرابی چھپی ہوئی ہوتی ہے۔
اِس سلسلے میں یہ بات ضرور نظر میں رہنا چاہیے کہ ایسے مقامات بھی سامنے

آتے ہیں جہاں "نہیں ہے" یا "نہیں ہیں" غیر مناسب نہیں معلوم ہوتے۔ مثلاً اِس جملے کو دیکھیے: "یہ لفظ ابھی تک زبان میں گھل مل نہیں سکا ہے۔" اِس جملے میں وہ بات نہیں جو مثلاً اِس جملے میں ہے: "وہ گھر میں جاتے نہیں ہیں" یوں کہ اِس آخری جملے میں "ہیں" غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔

لکھنے والے کی یہ ذمّے داری ہے کہ وہ دیکھ لے کہ "نہیں" کے ساتھ "ہے" یا "ہیں" لانا کس مقام مناسب ہے اور کہاں غیر مناسب۔ مثلاً یہ پوچھا جائے: وہ گھر میں ہیں؟ اِس کا جواب صرف "نہیں" بھی ہو سکتا ہے اور "نہیں ہیں" بھی کہہ سکتے ہیں۔ اب یہ لکھنے والے پر ہے کہ وہ سمجھ لے کہ یہاں "ہیں" ضروری ہے یا غیر ضروری۔ ذرا اِس عبارت کو دیکھیے:

"آپ نے "نگہت" لکھا ہے۔ مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ اصل لفظ نکہت ہے۔ نون کے اوپر زبر ہے اور نون کے بعد کاف ہے، گاف نہیں ہے"۔

اِس عبارت کے آخر میں "نہیں ہے" آیا ہے۔ "نہیں" کے بعد "ہے" لکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اِسی طرح "نون کے اوپر" کے بجائے "نون پر" لکھنا بہتر تھا۔ "نون کے اوپر زبر ہے اور نون کے بعد کاف ہے"۔ اِس ٹکڑے میں لفظ "نون" کی تکرار کھٹکتی ہے، خاص کر یوں کہ دونوں لفظوں کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں۔ اِس عبارت کو اِس طرح لکھا جا سکتا تھا:

"آپ نے "نگہت" لکھا ہے۔ مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ اصل لفظ "نکہت" ہے۔ نون پر زبر ہے اور اُس کے بعد گاف نہیں، کاف ہے"۔

اصل بات تو مکمل ہو گئی۔ اب ضمنی طور پر یہ کہنا ہے کہ واقعی اصل لفظ "نکہت" ہے۔ نون پر زبر ہے اور اُس کے بعد کاف ہے (نَ۔ کْ۔ ہَ۔ ت)۔ اِس کے معنی ہیں: خوش بو۔ اِسے "نگہت" نہیں لکھنا چاہیے اور بولنا چاہیے نون کے زبر کے ساتھ۔

ہاں شاعری میں "نہیں ہے" کچھ زیادہ ملتا ہے۔ شاعری کی بات الگ رہی

یہاں نثر کی بات ہو رہی ہے۔ نثر میں اِس طرف خاص طور سے توجّہ کرنے کی ضرورت ہے۔

○

یہ بات لکھی جا چکی ہے کہ جملے میں جس قدر مفرد لفظ لکھے جائیں، اُن کے معنی معلوم ہونا چاہیے۔ یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اُن کو جملے میں کس جگہ اور کس طرح لایا جائے۔ اِسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ عبارت میں اگر مرکّب لفظ آئے ہوں تو اُن کے متعلق بھی اطمینان کر لیا جائے۔

ایک مضمون میں یہ جملہ لکھا ہوا تھا: "اہلِ ہنود کی کتابوں میں یہ سب باتیں لکھی ہوئی ہیں"۔ ——— "اہلِ ہنود" صحیح ترکیب نہیں۔ "اہلِ ہند" ضرور صحیح مرکّب ہے، اِس کے معنی ہیں: ہندستان والے۔ اِس میں ہندو مسلمان، سکھ، عیسائی (وغیرہ) سبھی شامل ہیں۔ اِس جملے میں "اہلِ ہند" کا محل نہیں، یوں لکھنا چاہیے تھا: ہندوؤں کی کتابوں میں ...۔ "اہلِ ہنود" کے تو کچھ معنی ہی نہیں۔

○ ——— کسی مضمون یا کتاب وغیرہ کی تعریف میں یہ لکھنا کہ یہ معرکۃُ الآرا مضمون یا کتاب ہے، یا مثلاً کسی غزل کی تعریف میں یہ کہنا کہ بڑے معرکۃُ الآرا غزل کہی ہے، درست نہیں۔ تعریف کے بجائے اِس سے تو بُرائی ظاہر ہو گی، یعنی بات ہی بدل جائے گی، بل کہ یوں کہیے کہ بگڑ جائے گی۔

"معرکۃ الآرا" کے معنی ہیں: جس میں اختلافِ رائے بہت ہو۔ اصل میں "معرکۃ الآراء" تھا، یعنی آخر میں ہمزہ بھی تھا، اردو میں آکر ہمزہ تو نکل گیا (اِس لیے کہ وہ تلفّظ میں نہیں آتا تھا) "معرکۃ الآرا" رہ گیا۔ "آرا" جمع ہے "رائے" کی۔ یہ عربی کا لفظ ہے۔

ایک اور مرکّب ہے: معرکہ آرا۔ اِس میں "آرا" فارسی کا لفظ ہے۔ "آراستن" مصدر سے بنا ہے۔ "معرکہ آرا" کے معنی "زبردست، پُرزور" بھی ہیں۔ اِسی نسبت سے عمدہ غزل کو "معرکہ آرا" کہہ دیتے ہیں۔ معرکے کی غزل کہی

ہے، معرکہ آرا غزل کہی ہے ؛ یہ صحیح اندازِ بیان ہوگا۔ اگر اِس جگہ "معرکۃ الآرا" کہا جائے گا تو اُس کا مطلب اِس سے مختلف ہوگا۔

○ ——— ایک مرکّب "جیب و گریباں" کبھی کبھی دیکھنے میں آتا ہے۔ اِس کی ترکیب کو سمجھ لینا چاہیے، تاکہ غلطی نہ ہو۔

"جیب" اور "جَیب" دو مختلف لفظ ہیں۔ "جیب" مونث ہے، جو مثلاً اِس شعر میں آیا ہے:

ہم کہیں آتے اِس فریب میں ہیں
تم سے سو ایسے میری جیب میں ہیں

یہی "جیب" کبھی کبھی کٹ بھی جایا کرتی ہے۔ اِسی سے "جیب کترا" بنا ہے ——— "جَیب" دوسرا لفظ ہے۔ اِس میں جیم پر زبر ہے اور یہ مذکر ہے، جو مثلاً مرزا دبیر کے اِس شعر میں آیا ہے:

تھی صبح یا وہ چرخ کا جَیب دریدہ تھا
یا چہرۂ مسیح کا رنگِ پریدہ تھا

یا مثلاً مرزا غالب کا یہ شعر:

چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن
ہمارے جَیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے

یا جیسے غالب ہی کا یہ شعر:

دیوانگی سے دوش پہ زُنّار بھی نہیں
یعنی ہمارے جَیب میں اک تار بھی نہیں

"جَیب" کے معنی ہیں: گریبان۔ اِس لحاظ سے "جَیب و دامن" صحیح مرکّب ہے۔ اِس کے معنی ہوئے: دامن اور گریبان۔ اِس کے برخلاف "جَیب و گریباں" صحیح مرکّب نہیں، کیوں کہ دونوں لفظوں کے معنی ایک ہی ہیں ——— "جَیب و گریباں" کے معنی ہوئے: گریبان گریبان۔ اِن دونوں لفظوں "جیب" اور "جَیب" میں امتیاز کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ اگر یہ بات ذہن میں نہیں ہوگی تو عین ممکن ہے کہ غالب کے شعروں میں "جَیب" کو "جیب"

پڑھا جائے (ہماری جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے) اور مصرعے کو بے معنی بنا دیا جائے۔

○ ——— ایک مرکّب ہے "خط و خال"۔ اِسے "خدّ و خال" بھی لکھا گیا ہے۔ یہاں بھی وہی بات ہے۔ "خد" اور "خال" دونوں کے ایک ہی معنی ہیں: تِل۔ "خطّ و خال" لکھنا چاہیے۔

○

صفت کے تین درجے ہیں: اچھّا، بہت اچھّا، سب سے اچھّا۔ اِن میں سے ہر کلمہ با معنی ہے؛ لیکن ہم اُسے بے جگہ استعمال کریں گے تو بے معنی بن جائے گا۔ کسی معمولی دست کار کے لیے کہا جائے کہ وہ تو بہت اچھّا کاریگر ہے، تو یہ بے جا صرف ہوا۔ اُسی کے لیے اگر کہا جائے کہ وہ بہترین کاریگر ہے، تو یہ پہلے سے بھی بڑھ کر غیر مناسب صرف ہوا۔ "بہترین" کا وہی مفہوم ہے جو "سب سے اچھّا" کا ہے۔

یاد رکھیے کہ ہر اسمِ صفت ایک بیان ہے۔ جب ہم کوئی اسمِ صفت جملے میں لکھتے ہیں، تو گویا ہم ایک بیان دیتے ہیں، جس کی پوری ذمّے داری ہم پر عائد ہوتی ہے۔ معمولی جلسے کے لیے یہ کہنا کہ عظیم الشّان جلسہ تھا، غلط بیان دینے کے برابر ہے۔ معمولی شاعر کے لیے یہ کہنا کہ وہ بہت اچھّا شاعر ہے، یا یہ کہنا کہ وہ صاحبِ طرز شاعر ہے، جھوٹی گواہی دینے کے ہم معنی ہے۔

اسمِ صفت بہت سے ہیں، جیسے: اچھّا، بُرا، اعلا، ادنا، بے مثال، بے نظیر، عظیم الشّان (وغیرہ)۔ یہ تحریروں میں آتے رہتے ہیں اور گفتگو میں بھی شامل ہوتے ہیں۔ ہم اِن کو غیر مناسب طور پر استعمال میں لائیں گے، تو اِس سے دو بڑے نقصان ہوں گے۔ ایک تو یہ کہ اِن لفظوں کا مفہوم بگڑ کر رہ جائے گا۔ دوسرے یہ کہ ہماری تحریر میں خرابی پیدا ہوجائے گی اور ہم غلط بیانی کے مجرم قرار پائیں گے۔ اگر ہم صفاتی لفظوں کو غیر مناسب طور پر استعمال کرنے کے عادی بن جائیں گے، تو دوسرے لفظوں میں اِس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے

جھوٹ بولنے کی عادت ڈال لی ہے۔ یہ بات ہم سب کو معلوم ہے کہ جھوٹے کی بات اعتبار کے قابل نہیں رہتی۔

شاعروں کو جو بہت سی آزادیاں حاصل ہیں، اُن میں مبالغہ بھی شامل ہے؛ لیکن نثر لکھنے والا اُن کی راہ پر نہیں چل سکتا۔ نثر کے آداب شاعری کے مسلّمہ طور طریقوں سے مختلف ہیں۔ شاعر اسمِ صفات کو جس طرح استعمال کر لیتا ہے، نثر لکھنے والا اُس آزادی اور آسانی کے ساتھ اُن سے کام نہیں لے سکتا۔ نثر نگار اور شاعر دو الگ الگ راہوں کے راہی ہوتے ہیں۔

"بہتر"، اسمِ صفت ہے اور یہ صفت کا دوسرا درجہ ہے۔ درجوں کی ترتیب یہ ہے: بہ، بہتر، بہترین۔ اِسی ترتیب کے ساتھ اِن کے معنی ہیں: اچھا، بہت اچھا، سب سے اچھا۔ "بہتر" مرکّب لفظ ہے۔ "بہ" اور "تر" سے مل کر بنا ہے۔ "بہ" کے معنی ہیں: اچھا۔ "تر" کے معنی ہیں: زیادہ۔ اِس طرح "بہتر" کے معنی ہوئے: زیادہ اچھا یا بہت اچھا۔ اِس جملے کو دیکھیے: "وہ کام زیادہ بہتر ہے"۔ ظاہر ہے کہ معنی کے لحاظ سے "زیادہ" فالتو ٹھہرے گا۔ "بہتر" کے تو خود ہی معنی ہیں: زیادہ اچھا۔

خیال رکھنے کی بات یہ ہے کہ جب کسی اسم کے ساتھ "بہتر" لایا جائے، تو پھر اُس کے ساتھ "زیادہ" جیسے لفظ نہ لکھے جائیں۔ مثال کے طور پر اِس جملے کو دیکھیے: "زیادہ بہتر یہ ہے کہ اِس کام کو کیا ہی نہ جائے"۔ اِس میں "زیادہ" کی ضرورت نہیں، یوں کہ "بہتر" کے معنی ہیں: زیادہ اچھا۔

ایک اور جملہ: "آپ کا یہ افسانہ، پہلے افسانے کے مقابلے میں بہت بہتر ہے"۔ اِس جملے میں "بہت" زائد ہے ——— "بہت" اور "زیادہ"، اِن دونوں لفظوں کو ایسے لفظوں کے ساتھ نہیں لانا چاہیے جن کے آخر میں "تر" ہو۔ مثلاً ایسے جملے نہیں لکھنا چاہییں: بہت بدتر ہے، بہت بہتر ہے، زیادہ بہتر ہے، بہت کم تر ہے۔

کم تر، بیش تر، بدتر، خوب تر، اِن سب مرکّب لفظوں میں "تر"

بہ طور لاحقے کے آیا ہے اور اِس کے معنی ہیں: زیادہ ——— اِس طرح "کم تر" کے معنی ہیں: بہت کم۔ "بیش تر" کے معنی ہیں: بہت زیادہ۔ "بدتر" کے معنی ہیں: بہت بُرا یا زیادہ بُرا۔ اِسی طرح "خوب تر" کے معنی ہوئے: زیادہ اچھا یا بہت اچھا۔ مولانا حالؔی کے اِس مصرعے سے اِس مرکّب کا مفہوم اچھی طرح سمجھ میں آ سکے گا:

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں

خوب سے خوب تر: اچھے سے اچھا، بہت اچھا، زیادہ اچھا ———

اگر کوئی شخص کہے کہ "وہ فلم تو بہت خوب تر ہے"، تو آپ فوراً سمجھ جائیں گے کہ "بہت خوب تر"، ٹھیک نہیں۔ اِسی طرح اگر کوئی یہ کہے کہ "یہ کام بہت بہتر ہے"، تب بھی آپ کے ذہن میں یہی خیال آنا چاہیے کہ یہ ٹھیک نہیں۔ "بہت خوب تر" ہو یا "بہت بہتر"، دونوں میں "بہت" زائد ہے۔

ہاں، "بہت کم"، "بہت خوب"، "بہت زیادہ"، "بہت بُرا"، "بہت اچھا"، جیسے ٹکڑے بالکل صحیح ہیں، کیوں کہ اِن میں "بہت" زائد نہیں۔ "بہت بُرا"، ٹھیک ہے، مگر "بہت بدتر"، درست نہیں، یوں درست نہیں کہ "بدتر" میں خود "تر" کے معنی ہیں: بہت۔ پھر اُس کے ساتھ "بہت"، کیسے آ سکتا ہے۔

○

جملۂ معترضہ کو قوسین میں لکھا جاتا ہے۔ جملۂ معترضہ ایسے جملے یا عبارت کو کہتے ہیں جو اصل بات کا لازمی حصّہ تو نہ ہو، مگر اُسے کسی طرح کی ایسی نسبت حاصل ہو کہ لکھنے والے کی رائے میں اُس کا بھی لکھا جانا ضروری سا ہو۔ مثال کے طور پر: مرزا صاحب نے (جن سے آپ مل چکے ہیں) کہلا بھیجا ہے کہ میں کل آؤں گا ——— "جن سے آپ مل چکے ہیں"، جملۂ معترضہ ہے۔ یہ اصل بات کا حصّہ تو نہیں، مگر لکھنے والے کے خیال میں اِس کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

خیال رکھنے کی بات یہ ہے کہ جملۂ معترضہ اگر عبارت میں شامل ہو تو اِس کا لحاظ رکھا جائے کہ عبارت بے ربط نہ ہونے پائے۔ مثال کے طور پر اِسی جملے کو اِس طرح لکھ کر دیکھیے: ”مرزا صاحب (جن سے آپ مل چکے ہیں) نے کہلا بھیجا ہے کہ میں کل آؤں گا“۔ اِس جملے میں بے ربطی کا عیب موجود ہے۔ عیب یہ ہے کہ ”نے“ بے جگہ آیا ہے۔

اِس جملے کو دیکھیے: ”محمد حسین خاں صاحب (جن کے بھائی لکھنؤ میں تحصیل دار ہیں) کو میں ابھی تک خط نہیں لکھ سکا“۔ یہاں بھی بے ربطی کا عیب موجود ہے۔ اِس میں ”کو“ بے جگہ آیا ہے۔ یوں لکھنا چاہیے تھا: محمد حسین خاں صاحب کو (جن کے بھائی لکھنؤ میں تحصیل دار ہیں) میں ابھی تک خط نہیں لکھ سکا۔

بے ربطی کا عیب کئی صورتوں میں پیدا ہو جایا کرتا ہے۔ سب کی مثالیں دینا مشکل ہے۔ خیال رکھنے کی بات یہ ہے کہ جب بھی عبارت میں جملۂ معترضہ کے طور پر کوئی جملہ یا عبارت آئے، تو دیکھ لیا جائے کہ قوسین سے پہلے اور قوسین کے بعد کی عبارت میں کسی طرح کی بے ربطی تو پیدا نہیں ہوئی۔ جس لفظ کو یا لفظوں کو پہلے قوس سے پہلے آنا چاہیے تھا، وہ دوسرے قوس کے بعد تو نہیں آ گئے۔ اوپر کے دونوں جملوں کو مثال کے طور پر سامنے رکھا جا سکتا ہے۔ پہلے جملے میں ”نے“ اور دوسرے جملے میں ”کو“ کی صحیح جگہ قوسین سے پہلے ہے۔ جب اِن کو قوسین کے بعد لکھا جائے گا تو کہا جائے گا کہ عبارت میں تعقید پیدا ہو گئی ہے۔ ”تعقید“ کا مطلب یہ ہے کہ ادائے مطلب کے لحاظ سے جملے میں کسی لفظ کو جہاں آنا چاہیے تھا وہ اُس جگہ سے ہٹ کر آیا ہے۔ اِسے عیب مانا جاتا ہے۔ تعقید سے اصل خرابی یہ پیدا ہوتی ہے کہ روانی ختم ہو جاتی ہے اور بیان کا حُسن ماند پڑ جاتا ہے۔

مزید وضاحت کے لیے ایک اور مثال۔ ہمارے ایک مشہور ادیب نے لکھا ہے: ”رفتہ رفتہ غالبؔ کے مولوی سراج الدّین احمد سے تعلقات میں گہرائی پیدا ہو گئی“ ـــــ اِس جملے کو دو تین بار پڑھیے۔ آپ خود

محسوس کریں گے کہ پہلے ٹکڑے میں ”کے“ بے جگہ آیا ہے اور ”سے“ بھی عبارت میں کھپا نہیں، اُکھڑا اُکھڑا سا لگتا ہے۔ اِس جملے کو اِس طرح لکھ کر دیکھیے: رفتہ رفتہ غالبؔ اور مولوی سراج الدّین احمد کے تعلقات میں گہرائی پیدا ہو گئی ـــــ اب بات صاف ہو گئی۔ اُس جملے میں ”کے“ بے جگہ آیا تھا اور ”سے“ زائد تھا۔ اِن دونوں نے مل کر عبارت کی خوبی کو دُھندلا دیا تھا۔ تعقید کا عیب پیدا ہوا، جس نے روانی پر بُرا اثر ڈالا اور ایک زائد لفظ نے بندش کی چُستی کو نقصان پہنچایا۔ جب ”کے“ صحیح جگہ آیا، وہ عیب جاتا رہا اور ”سے“، جو زائد تھا، وہ اپنے آپ نکل گیا۔

اِس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ جب بھی کوئی جملہ لکھا جائے تو یہ دیکھ لیا جائے کہ اُس میں کوئی لفظ ادائے مطلب کے لحاظ سے بے جگہ تو نہیں آیا۔ یہ بھی دیکھ لیا جائے کہ زائد لفظ تو عبارت میں شامل نہیں ہو گیا۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ عبارت میں تعقید کا عیب پیدا ہو جائے، تو وہ عبارت اپنا حُسن کھو دیتی ہے۔

○

روزمرّہ اور محاورہ، اِن دونوں کا ذکر شروع میں آ چکا ہے۔ یہ لکھا جا چکا ہے کہ گفتگو اور تحریر، دونوں کو روزمرّہ کے مطابق ہونا چاہیے۔ جیسے ”پانی پینا“ روزمرّہ ہے، یعنی اردو والے ”پانی پینا“ کہتے ہیں۔ اگر کوئی شخص اِس کی جگہ ”آب پینا“ کہے، تو اُسے روزمرّہ کے خلاف کہا جائے گا۔ ”پانی“ اور ”آب“ دونوں کے معنی ایک ہیں۔ ”آب پینا“ کے معنی ”پانی پینا“ ہوئے۔ پھر بھی اِسے درست نہیں کہا جائے گا۔ وجہ یہی ہو گی کہ اردو والے ”پانی پینا“ کہتے ہیں، ”آب پینا“ نہیں کہتے۔ روزمرّہ کی تعریف لکھی جا چکی ہے، یعنی اُس طرح لکھنا اور بولنا، جس طرح معیاری اردو میں لکھتے اور بولتے ہیں۔

روزمرّہ کی طرح محاورے کا صحیح ہونا بھی ضروری ہے۔ محاورے

میں مجازی معنی مراد لیے جاتے ہیں۔ مثلاً ایک محاورہ ہے "ناک کٹنا"۔ اس کے معنی ہیں: کسی کے آگے ذلیل و خوار ہونا، سُبکی ہونا۔ یہ مجازی معنی ہیں۔ اگر کسی کی ناک سچ مچ ترش گئی ہو اور کہا جائے کہ اُس کی ناک کٹ گئی، تو اُس صورت میں اِسے محاورہ نہیں کہا جائے گا، کیوں کہ یہ حقیقی معنی ہیں۔ "ناک" سے سچ مچ کی ناک مراد لی جائے، تو یہ حقیقی معنی ہوئے۔ اگر "ناک" سے "عزّت و آبرو" مراد لی جائے تو یہ مجازی معنی ہوئے۔

خیال رکھنے کی بات یہ ہے کہ محاورے کو اُسی طرح استعمال کیا جائے جس طرح وہ مستعمل رہا ہے۔ اُس میں کسی طرح کی تبدیلی نہ کی جائے۔ اِس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی ذہن میں رکھنے کی ہے کہ جس جگہ محاورے کو (یا کسی خاص مرکّب کو) استعمال کیا جائے، تو یہ بھی دیکھ لیا جائے کہ معنے مطلب کے لحاظ سے یہاں ایسا کوئی پہلو تو پیدا نہیں ہو جائے گا جو لکھنے والے یا بولنے والے کے اصل مفہوم سے مختلف ہو۔ اِس سلسلے میں ایک دل چسپ واقعہ یاد آگیا۔

میر ناصر علی دہلوی اپنے زمانے کے بہت مشہور ادیب تھے۔ اُن کا رسالہ صلائے عام آج تک اپنے نام کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔ میر صاحب کی نثر اور اُن کی زبان دانی کی اُس زمانے میں دھوم تھی۔ دہلی کے مشہور ادیب شاہد احمد دہلوی (مرحوم) نے میر صاحب کا خاکہ لکھا تھا، جو اُن کے مجموعۂ مضامین گنجینۂ گوہر میں شامل ہے۔ اُس میں کئی دل چسپ واقعات لکھے ہیں۔ اُن میں سے ایک واقعہ آپ سن لیجیے۔ منظر یہ ہے کہ ایک صاحب ملنے کے لیے آئے ہیں اور بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے ہیں۔ باقی واقعہ شاہد صاحب کے الفاظ میں:

"عقیدت مند نے بڑی لجاجت سے کہا: آپ کو زحمت دینے کی معافی مانگتا ہوں۔

میر صاحب تنک کر بولے: میاں صاحب زادے! معافی کیا مانگتے ہو، بھیک مانگو بھیک۔ وہ بچارے اپنا سا منھ لے کر رہ گئے۔ غلط

اردو سُن کر میر صاحب آپے سے باہر ہو جاتے تھے"

مطلب یہ ہے کہ اُن صاحب کو کہنا چاہیے تھا کہ "معافی چاہتا ہوں"۔

معافی چاہنا اور معافی مانگنا، اپنی اپنی جگہ دونوں بامعنی ہیں، لیکن دونوں کے استعمال کے موقعے الگ الگ ہیں۔ کسی شخص نے کوئی ایسی بات کہی جو نہیں کہنا چاہیے تھی، یا کوئی ایسا کام کیا جو مناسب نہیں تھا؛ ایسے موقعوں پر تہذیب کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ معذرت کی جائے اور کہا جائے: "معافی چاہتا ہوں"۔ یعنی ایک مہذب آدمی کو اپنی غلطی کا احساس ہوا، اُس نے غلطی کا اعتراف کیا اور تمیز داری کے آداب کے ساتھ معذرت کی۔

دوسری صورت اِس سے مختلف ہے۔ ذرا دیر کے لیے مان لیجیے کہ ایک صاحب کسی سیاسی ایجی ٹیشن میں شامل ہو کر جیل چلے گئے۔ جیل کی سختیوں سے گھبرا کر یا کسی اور وجہ سے صلح سمجھوتے پر اُتر آئے اور معافی نامے پر دستخط کر کے جیل سے باہر آگئے۔ ایسے صاحب کے لیے کہا جاتا ہے کہ وہ تو معافی مانگ کر چلے آئے، "اُنھوں نے معافی مانگ لی"۔ یہ تو آپ مانیں گے کہ اِس میں بُرائی کا پہلو جھلک رہا ہے۔ یہاں معافی مانگنے اور بھیک مانگنے میں کچھ فرق نہیں رہا۔ "معافی مانگنا" میں کبھی بُرائی کا اور کبھی طنز کا مفہوم شامل ہوتا ہے، اِس پر نظر رکھنا چاہیے۔

○ —— ایک صاحب نے اپنے مضمون میں لکھا تھا: "ایک بے نام سی کسک اُس کے سینے میں ٹیس مارتی تھی"۔ اتفاق یہ ہوا کہ ایک جلسے میں اُنھوں نے یہ مضمون پڑھا۔ کئی سُننے والوں نے سرِ محفل کہا کہ "ٹیس مارنا" درست نہیں۔ اعتراض صحیح تھا۔ بچارے کو بھری محفل میں شرمندہ ہونا پڑا۔

میر انیس کا مشہور شعر ہے:

کھا کھا کے اُوس اَور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

مولانا شبلی نے اِس طرف توجہ دلائی ہے کہ اِس شعر میں "اوس" کی جگہ

"شبنم"، لکھا جائے، تو شعر کی فصاحت ختم ہو جائے گی۔ مشہور اُستاد اور زبان داں آرزو لکھنوی نے اپنی کتاب نظامِ اردو میں اِس شعر سے متعلق یہ وضاحت کی ہے کہ یہاں "شبنم"، اِس لیے بے محل ہو گا کہ محاورہ ہے "اوس کھانا"، "شبنم کھانا"، محاورہ نہیں۔ میرانیس تو زبان، روزمرّہ اور محاورے کی نزاکتوں سے خوب واقف تھے، اِسی لیے اُنھوں نے "کھا کھا کے شبنم" نہیں لکھا۔

○ ——— ایک بڑے ادیب نے لکھا ہے: "اُنھوں نے اوّل درجے میں بی۔ اے کا امتحان کام یاب کیا تھا"۔ اِس جملے میں روزمرّہ کی غلطی ہے۔ روزمرّہ ہے: امتحان میں کام یاب ہونا۔ امتحان کامیاب کرنا، روزمرّہ نہیں۔

○ ——— بعض لوگ "استفادہ حاصل کرنا"، لکھتے ہیں۔ یہ درست نہیں۔ "استفادہ کرنا"، مستعمل ہے۔ مثلاً: انھوں نے مغربی علوم حاصل کیے تھے اور مشرقی علوم کے ماہرین سے بھی استفادہ کیا تھا۔ اگر یہاں "استفادہ حاصل کیا تھا"، لکھا جائے، تو جملہ غلط ہو جائے گا۔ وجہ یہ ہے کہ "استفادہ" میں حاصل کرنے کا مفہوم شامل ہے۔ "استفادہ حاصل کیا"، میں لفظِ "حاصل"، زائد ہے، اِسی لیے "استفادہ کرنا"، صحیح ہے اور "استفادہ حاصل کرنا"، درست نہیں۔

○ ——— سیّد مسعود حسن رضوی (مرحوم) مشہور ادیب اور زبان داں تھے۔ ڈاکٹر محمد حسن نے ایک مضمون میں مرحوم کا ایک واقعہ لکھا ہے:

"جملوں میں لفظوں کا صحیح دروبست اور ہر لفظ کی معنوی پرتوں پر نظر، اُن کی تحریر اور گفتگو، دونوں کا وصف ہے۔

ایک بار جوش ملیح آبادی نے، جو خود زبان داں تھے اور لفظ لفظ کی صحت کا خیال رکھتے تھے، اپنی مشہور نظم پڑھی جس کا ٹیپ کا مصرع تھا:

رواں دواں بڑھے چلو، رواں دواں بڑھے چلو

داد سے چھتیں اڑ گئیں۔ جلسے کے بعد چائے پر مسعود صاحب نے جوش ملیح آبادی کو الگ بُلا کر، بڑی نرمی اور شایستگی سے کہا: "جوش صاحب! جب یہ نظم شائع کریں تو یہ نوٹ ضرور دے دیجیے گا کہ "رواں دواں"، یہاں لغوی معنی میں استعمال ہوا ہے، محاورے کے اعتبار سے نہیں۔

جوش صاحب چونکنا ہو گئے، بولے: "اور محاورے میں اِس کا کیا مفہوم ہے"؟ مسعود صاحب نے بتایا "رواں دواں"، کا محاورے کے اعتبار سے وہ مفہوم ہے جو صفی لکھنوی نے یتیموں کے بارے میں اپنی نظم میں ادا کیا ہے:

رواں دواں ہیں، غریب الدّیار ہیں ہم لوگ

رواں دواں، یعنی مارے مارے پھرنے والے، بے سہارا لوگ"

(غالب نامہ۔ مسعود حسن رضوی نمبر)

اِس لفظ "رواں دواں"، کا یہ معنوی پہلو جوش صاحب کی نظر میں نہیں تھا، یوں وہ اِس طرح لکھ گئے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ معنوی خرابی کا پہلو نکل آیا اور اِس طرح مفہوم بگڑ گیا۔ اُنھوں نے کہنا یہ چاہا تھا کہ زور شور اور عزم و ارادے کے ساتھ آگے بڑھتے چلو۔ مگر اِس میں یہ پہلو پیدا ہو گیا کہ مارے مارے پھرنے والے بے سہارا لوگوں کی طرح چلتے رہو۔

○ ——— ایک مشہور لکھنے والے نے ایک صاحب کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے: "بوڑھے ہو چکے ہیں، بیمار رہتے ہیں، پھر بھی روزانہ لائبریری جاتے ہیں۔ سچ ہے، چور چوری سے جائے، ہیرا پھیری سے کیا جائے"۔ کیسی بُری غلطی ہوئی کہ تعریف کے بجائے بُرائی نکل آئی۔ یہ مثل "چور چوری سے جائے ..."، تعریف کے موقعے پر استعمال میں نہیں آتی۔ کسی کی برائی کرنا ہو، تب لکھتے ہیں۔

○ ——— اُردو زبان کی جو خوبیاں بیان کی جاتی ہیں، اُن میں سے ایک خوبی یہ بھی ہے کہ باتوں میں سلیقے اور تمیز کی روشنی شامل ہوتی ہے۔

اگر یہ بات درست ہے اور آپ کو بھی اِس سے اتفاق ہے تو ذرا دیر کے لیے اِس طرف توجّہ کیجیے۔ ایک عزیز دوست آپ سے ملنے کے لیے آتے ہیں۔ آپ اُن کی خاطر تواضع کرتے ہیں، ادب آداب کے ساتھ پیش آتے ہیں اور خوش سلیقگی کے ساتھ وقت گزارتے ہیں۔ جب وہ چلنے لگتے ہیں تو آدابِ مہمان نوازی کے مطابق آپ کچھ دور تک اُن کے ساتھ چلتے ہیں اور بہت خلوص کے ساتھ کہتے ہیں: آئیے میں آپ کو بس اسٹینڈ تک چھوڑ آؤں۔ آپ ذرا سی توجّہ سے کام لیں تو خود محسوس کریں گے کہ بے خیالی میں ایک غیر مناسب جملہ آپ کے منہ سے نکل گیا۔ بات یہ ہے کہ کچھ جملوں میں روز مرّہ کے لحاظ سے "چھوڑنا" اچھے مفہوم میں استعمال نہیں کیا جاتا، ترکِ تعلق کا مفہوم نکلتا ہے۔ یہ جملہ بھی اُسی انداز کا ہے۔ مثلاً کہتے ہیں: فلاں شخص نے اپنی بیوی کو چھوڑ دیا۔ یا جیسے ایک بلّی بہت پریشان کرنے لگی۔ کبھی دودھ پی گئی، کبھی گوشت کھا لیا۔ کسی ترکیب سے اُس کو پکڑ لیا۔ بوری میں یا بڑے تھیلے میں بند کر دیا اور کہا: جاؤ اِسے دریا پار چھوڑ آؤ۔ تو یہ ہے چھوڑ آنے کا مفہوم —— اب آپ ہی غور کیجیے کہ آپ کی بات کیسی بگڑی! آپ کہنا تو یہ چاہتے تھے کہ میں بس اسٹینڈ تک ساتھ چلوں گا، اور مطلب یہ ہو گیا کہ آپ اُن صاحب کو (بلّی کی طرح) چھوڑنے جا رہے ہیں۔

ایسے جملے سُننے میں آجایا کرتے ہیں: میں بچّے کو اسکول چھوڑنے جا رہا ہوں۔ میں اُن کو اسٹیشن چھوڑنے جاؤں گا (وغیرہ)۔ یہ غیر مناسب اندازِ بیان ہے۔ آسانی کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ بس اسٹینڈ تک آپ کے ساتھ چلوں گا، یا میں وہاں تک آپ کا ساتھ دوں گا۔ اور بھی مناسب اندازِ بیان ہو سکتے ہیں۔ غیر مناسب اور بات کو بگاڑنے والا اندازِ بیان اختیار کرنا کسی طرح مناسب نہیں۔ خیال رکھیے کہ نہ آپ کی زبان خراب ہو اور نہ اُردو زبان بگڑنے پائے۔

○ —— روزمرّہ اور محاورے کی طرح جملے میں فعل کو بھی صحیح صورت میں آنا چاہیے۔ کوئی صاحب کہیں کہ "یہاں پرسوں بہت بڑا جلسہ

ہونے جا رہا ہے" تو اِس پر ٹوک دینا چاہیے۔ یہ کہا جا سکتا تھا کہ پرسوں یہاں بہت بڑا جلسہ ہوگا۔ یوں بھی کہہ سکتے تھے کہ پرسوں یہاں بہت بڑا جلسہ ہونے والا ہے۔ "ہونے جا رہا ہے" تو نرا انگریزی کا ترجمہ ہے ایسا ترجمہ جو اُردو زبان کے مزاج اور اِس زبان کے اندازِ بیان سے میل نہیں کھاتا۔

ذرا دیر کے لیے مان لیجیے کہ آپ کا نام محمود ہے۔ آپ سے کہا گیا کہ بازار سے سودا لے آئیے۔ آپ چل دیے یا چلنے کے لیے تیار ہو گئے۔ اُس صورت میں اگر یہ کہا جائے کہ محمود سودا لینے بازار جا رہے ہیں، تو یہ جملہ بالکل درست ہوگا۔ یوں درست ہوگا کہ آپ واقعی بازار جا رہے ہیں۔

جا رہا ہے، کر رہا ہے، لکھ رہا ہے، ہو رہا ہے (وغیرہ) فعلِ حال کی یہ سب صورتیں کام کے جاری ہونے کو ظاہر کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر کسی علاقے میں ایک اسکول بنائے جانے کا پروگرام ہے، اُس کے لیے یہ کہا جائے کہ "اسکول بننے جا رہا ہے"، تو یہ صحیح اندازِ بیان نہیں ہوگا۔ یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہاں ایک اسکول بنے گا، یہاں ایک اسکول بنایا جائے گا (وغیرہ)۔ مختصر یہ کہ "ہونے جا رہا ہے" جیسے ٹکڑوں کے استعمال میں احتیاط کی ضرورت ہے۔

اِس سلسلے میں تھوڑی سی وضاحت غیر مناسب نہ ہوگی۔ جا رہا ہے، کر رہا ہے (وغیرہ) فعلِ حال کی شکلیں ہیں۔ اِن کے استعمال میں عام طور پر غلطی نہیں ہوتی۔ اِن شکلوں کو عام طور پر زمانۂ حال کے لیے اور خاص صورتوں میں زمانۂ مستقبل کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں، جیسے: میں پرسوں دہلی جا رہا ہوں (یعنی جاؤں گا)۔ گڑبڑ اُس وقت ہوتی ہے جب اِن سے پہلے کوئی اور ٹکڑا بھی ہوتا ہے، جیسے: کرنے جا رہا ہوں، لانے جا رہا ہے، لکھنے جا رہا ہے، ہونے جا رہا ہے۔ (وغیرہ) ایسی صورتوں میں، یعنی جب فعلِ حال سے پہلے مصدر محرّف صورت میں آئے (یعنی: لانے، کرنے، ہونے

وغیرہ کا اضافہ ہو) تب اُنھیں فعلِ مستقبل کے لیے استعمال نہیں کرنا چاہیے۔
مثلاً: گھنٹا بھر بعد جلسہ ہونے والا ہو، تو یہ نہیں کہنا چاہیے کہ جلسہ ہونے جا رہا ہے۔

ایسی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں، لیکن یہاں گنجایش نہیں۔ بس یہ بات ذہن میں بٹھانا ہے کہ جب ہم کچھ لکھیں، یا کچھ کہیں، تو یہ ضرور دیکھ لیں کہ اِس میں کوئی غلطی، کسی طرح کی خرابی یا برائی تو نہیں۔ احتیاط کی عادت پڑ جائے تو پھر ذہن بھی اپنا کام کرتا رہتا ہے اور نظر بھی اپنا کام کرتی رہتی ہے۔

تلفّظ

املا اور انشا، دونوں کا تعلق لکھنے سے ہے۔ یہ ٹھیک ہے، مگر جو کچھ لکھا گیا ہے، اُسے پڑھا بھی جائے گا، یوں تلفّظ بھی اِس عمل کا ضروری حصّہ بن جاتا ہے۔ جس طرح غلط املا پر اعتراض کیا جائے گا، اُسی طرح غلط تلفّظ پر بھی ٹوکا جائے گا۔ لفظوں کا صحیح تلفّظ نہ معلوم ہو تو بار بار شرمندگی اُٹھانا پڑے گی۔ سبق پڑھنے یا پڑھانے کے دوران کسی لفظ کو صحیح طور پر نہیں پڑھا، تو دیکھیں سب کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے گا۔ کوئی مضمون پڑھ کر سُنایا اور کسی ایک لفظ کا تلفّظ بھی غلط ہو گیا تو بڑی رُسوائی ہو گی۔ یہ اُمید کی جاتی ہے کہ اچھے طالبِ علم لفظوں کو صحیح طور پر ادا کریں گے۔ ہم اپنے صحیح لکھے ہوئے کو غلط کر کے پڑھیں، یہ کوئی اچھّی بات نہیں۔

مثال کے طور پر ایک لفظ "گذشتہ" کو لیجیے۔ اِسے "گزشتہ" لکھا گیا تو یہ املا کی غلطی ہو گی۔ لکھا تو صحیح طور پر "گذشتہ" (ذال کے ساتھ) لیکن جب پڑھنے کھڑے ہوئے تو "گُذِشتہ" پڑھا (ذال کے نیچے زیر)، یہاں لکھاوٹ صحیح رہی، تلفّظ غلط ہو گیا۔ اِس لفظ کا صحیح تلفّظ "گُذَشتہ" ہے۔ (گاف پر پیش، ذال پر زبر)۔ کاغذ پر لفظ صحیح طور پر لکھا ہوا ہے، مگر وہ کاغذ تو آپ کی آنکھوں کے سامنے ہے، سُننے والے تو آپ کی زبان سے غلط تلفّظ سُن رہے ہیں۔

لفظ کا صحیح املا معلوم ہو، یہ ضروری ہے۔ یہ بھی اُسی قدر ضروری ہے کہ اُس لفظ کا صحیح تلفّظ بھی معلوم ہو۔ سبق پڑھتے ہوئے اگر "تَوَجِّہ" کہا گیا تو ٹوکا جائے گا۔ کہا جائے گا کہ "تَوَجُّہ" کہنا چاہیے۔ عُلَما، اُدَبا، طَلَبہ کہا جائے، تب بھی ٹوکا جائے گا۔ یوں کہ اِن کا صحیح تلفّظ عُلَما، اُدَبا، اور طَلَبہ ہے۔

زیادہ مشکل اُن لفظوں میں پیش آتی ہے جن میں تلفّظ کی تبدیلی سے معنی بدل جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر لفظِ "مجاز" کو لیجیے۔ اِسے "مَجاز" (میم کے زبر کے ساتھ) پڑھا جائے تو یہ حقیقت کا متضاد ہوگا۔ اقبال کے اِس شعر میں یہ لفظ اِسی معنی میں آیا ہے :

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

اب اِس جملے کو دیکھیے : "ہم نے اُن کو مجاز کر دیا ہے کہ وہ ہماری طرف سے یہ کام کریں گے"۔ اِس جملے میں بھی "مجاز" آیا ہے، مگر یہاں یہ دوسرے لفظ کے طور پر آیا ہے۔ اِس کا تلفّظ "مُجاز" (میم کے پیش کے ساتھ) ہے۔ اِس کے معنی ہیں : اجازت رکھنے والا، جس کو اجازت دی گئی ہو۔ اگر اِس جملے میں "مَجاز" پڑھا جائے گا تو مفہوم خبط ہو جائے گا۔ مطلب یہ ہوا کہ "مَجاز" اور "مُجاز" دو الگ الگ لفظ ہیں۔ املا ایک ہے، تلفّظ مختلف ہے اور اِسی نسبت سے معنی بھی الگ الگ ہیں۔

"شہید" کی جمع "شُہَدا" ہے (شین پر پیش، ہ پر زبر)۔ جیسے شُہَدائے کربلا۔ ایک اور لفظ ہے "شُہْدا" (شین پر پیش، ہ ساکن)۔ یہ آوارہ، بدکردار جیسے مفہوم میں آتا ہے (پہلے اِس کے کچھ اور معنی تھے)۔ اگر "شُہَدا" کو "شُہْدا" کہا جائے تو مفہوم پر کیا گزر جائے گی؟

"فاضِل" کی جمع "فُضَلا" ہے (ف پر پیش، ض پر زبر)۔ ایک اور لفظ ہے "فُضْلہ" (جیسے : سارا فُضْلہ خارج ہو گیا)۔ املا مختلف ہے، تلفّظ ایک ہے۔ "فُضَلا" کو اگر "فُضْلا" پڑھا جائے گا تو پھر یہ لفظ تلفّظ

میں آ کر "فُضْلہ" بن جائے گا۔ آپ اِس سے اتّفاق کریں گے کہ یہ کچھ اچھی بات نہیں ہوگی۔

ہم کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ صحیح تلفّظ مَرَض ہے یا مَرْض، حَلَق ہے یا حَلْق، عَرَق ہے یا عَرْق، عِطْر ہے کہ عِطَر، وَرَق ہے کہ وَرْق (وغیرہ)۔ جب ہم مَرَض، وَرَق، عَرَق، حَلْق، عِطْر کہیں گے، تب سمجھا جائے گا کہ ہمیں اِن لفظوں کا تلفّظ معلوم ہے۔

ایک لفظ ہے "شادی مرگ"۔ اصل میں "مرگِ شادی" تھا۔ اضافتِ مقلوب نے اِسے "شادی مرگ" بنا دیا۔ اِسے "شادیِ مرگ" کہا جائے تو تلفّظ غلط ہو جائے گا۔ یا جیسے "پس منظر" کو "پسِ منظر" کہا جائے، تب بھی یہی کہا جائے گا کہ تلفّظ غلط ہو گیا۔ یا جیسے "سرورق" اور "سرِ ورق" دو مختلف لفظ ہیں۔ دونوں کے معنی الگ الگ ہیں۔ مثلاً یہ کہا جائے کہ اِس کتاب کا سرِ ورق خوب صورت ہے، تو مفہوم بگڑ جائے گا۔ یہاں "سرورق" کہنا چاہیے تھا (اضافت کے بغیر)۔ اِن لفظوں کو یہاں محض بہ طورِ مثال لکھا گیا ہے۔ اِن کی مفصّل بحث اِسی کتاب کے دوسرے حصّے میں "اضافت" کا زیراکے عنوان کے تحت ملے گی۔

مرزا غالب کا مشہور شعر ہے :

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رَو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہ بر کو میں

"تیز رَو" (رے پر زبر) کے معنی ہیں : تیز چلنے والا۔ فارسی کا ایک مصدر ہے "رفتن"۔ اِس کے معنی ہیں : چلنا۔ "رفتار" اِسی سے بنا ہے۔ اِسی سے "رَو" بنا ہے اور اِسی "رَو" سے "تیز رَو" بنا ہے۔

فارسی میں ایک اور مصدر ہے "رُوئیدن"۔ اِس کے معنی ہیں : اُگنا۔ "رُوئیدگی" اِسی سے بنا ہے۔ اِس مصدر سے فعلِ امر "رُو" بنتا ہے۔ اِس سے ایک اسمِ فاعل "خود رُو" بنا ہے۔ اِس کے معنی ہیں : اپنے آپ اُگ آنے والا۔

لالۂ خود رُو نہیں ہے ، خون نے فرہاد کے
جوش میں آکر لگا دی کوہ کے دامن میں آگ

"لالہ" مشہور پھول ہے سرخ رنگ کا ۔ اِس کا اصلی وطن ایران ہے ، جہاں یہ پہاڑوں کے دامن میں کھلتا ہے ۔ بے شمار پھول ہوتے ہیں ۔ دور سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑ کے دامن میں آگ لگی ہوئی ہے ، دہکتے ہوئے انگارے بکھرے ہوئے ہیں ــــــــ "لالۂ خود رُو" کے معنی ہیں : اپنے آپ اُگ آنے والا لالہ ۔ اِسے اگر "لالۂ خود رَو" پڑھا جائے تو اِس کے معنی ہوں گے : اپنے آپ چلنے والا لالہ ۔ مطلب چوپٹ ہوگیا نا ! ــــــــ تیز رَو : تیز چلنے والا ۔ خود رُو : اپنے آپ اُگنے والا ۔ یہ معنوی فرق نہ معلوم ہو تو ظاہر ہے کہ "رو" کا تلفظ غلط ہو سکتا ہے ۔ تلفظ غلط ہوا تو معنی بدل جائیں گے ، بل کہ یہ کہیے کہ بگڑ جائیں گے ۔

فراق گورکھ پوری نے ایک نظم لکھی ہے جس میں بچپن کا ذکر کیا ہے کہ بچہ کس چیز کو کیا سمجھتا ہے ۔ اسی نظم کا ایک ٹکڑا ہے :

سمجھ سکے کوئی اے کاش عہدِ طفلی کو
نمودِ لالۂ خود رُو میں دیکھنا جنّت
کرے نظارۂ کونین اک گھروندے میں

اِس میں بھی "لالۂ خود رُو" (رے کے پیش کے ساتھ) ہے ۔

میر تقی میر کا مشہور شعر ہے :

دلّی کے نہ تھے کوچے ، اوراقِ مصوّر تھے
جو شکل نظر آئی ، تصویر نظر آئی

ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ "مُصَوِّر" اور "مُصَوَّر" دو مختلف لفظ ہیں ۔ "مُصَوِّر" کے معنی ہیں : تصویر بنانے والا ۔ یہ عربی کا اسمِ فاعل ہے ۔ "مُصَوَّر" (واو کے زبر کے ساتھ) اسمِ مفعول ہے ۔ معنی ہیں : وہ تصویر جسے بنایا گیا ہے ۔ "اوراقِ مُصَوَّر" کا مطلب ہے ایسے ورق جن پر تصویریں

بنی ہوئی ہیں ۔ (مُرقّع ، ایسے ہی اوراق کے مجموعے کو کہتے ہیں) ۔ شاعر نے دلّی کے گلی کوچوں کو "اوراقِ مُصوّر" کہا ہے اور اُن دنوں کو یاد کیا ہے جب دلّی کی ہر گلی خوب صورت چہروں سے معمور تھی ۔

فیض احمد فیض کی ایک مشہور نظم کا عنوان ہے : "آج بازار میں پابہ جولاں چلو" ۔ نظم اِس طرح شروع ہوتی ہے :

چشمِ نم ، جانِ شوریدہ کافی نہیں
تہمتِ عشقِ پوشیدہ کافی نہیں
آج بازار میں پابہ جولاں چلو

"جُولاں" (جیم پر پیش) کے معنی ہیں : بیڑی ۔ "پابہ جُولاں" کے معنی ہوئے : جس کے پیروں میں بیڑیاں پڑی ہوئی ہوں ۔

ایک اور لفظ ہے "جَولاں" (جیم کے زبر کے ساتھ) ۔ اِسی سے "جَولانی" بنتا ہے اور اِس سے "جَولانیِ طبع" بنا ہے ، جس کے معنی ہیں : طبیعت کی روانی ، اُمنگ ۔ "جَولاں" کے لفظی معنی ہیں : گھوڑا دوڑانا ، کُدانا ۔

مطلب یہ ہوا کہ "جُولاں" اور "جَولاں" دو مختلف لفظ ہیں ۔ فیض کی اِس نظم میں "پابہ جُولاں" (جیم کے پیش کے ساتھ) آیا ہے ۔ اِسے اگر جیم کے زبر کے ساتھ "پابہ جَولاں" پڑھا جائے ، تو مطلب بدل جائے گا ۔ بدل کیا جائے گا ، بگڑ جائے گا ۔

مرزا غالب کا مشہور شعر ہے :

چاک مت کر جیب بے ایّامِ گُل
کچھ اُدھر کا بھی اشارا چاہیے

پہلے مصرعے میں ایک لفظ "جیب" آیا ہے ۔ اِس کی دو صورتیں ہیں : جَیب ، جِیب ۔ "جیب" کے معنی ہیں : پاکٹ ، مثلاً : قمیص کی جیب میں روپے ہیں ۔ "جَیب" کے معنی ہیں : گریبان ، جسے شاعروں کی روایت کے مطابق عاشق جوش میں آکر چاک کر دیا کرتا تھا ۔ غالب کے اِس شعر میں "جَیب"

ہے۔ اِسے ''رجیب'' پڑھا جائے، یعنی: چاک مت کر جیب بے ایامِ گُل۔ تو شعر کے معنی چوپٹ ہو جائیں گے۔ اِس کے ساتھ ساتھ سُننے والے یہی رائے قائم کریں گے کہ اِس شخص کو اِس لفظ کا نہ تلفّظ معلوم ہے اور نہ یہ اِس کے معنی جانتا ہے۔ یہ کچھ اچھّی بات تو نہیں ہوگی!!

ایک ضروری وضاحت۔ اِس غزل کا مطلع یہ ہے:

چاہیے اچھّوں کو، جتنا چاہیے
یہ اگر چاہیں، تو پھر کیا چاہیے

اِس میں ''چاہیے'' ردیف ہے اور ''جتنا'' اور ''کیا'' قافیے ہیں۔ اِن دونوں کے آخر میں الف ہے۔ اِس لیے قاعدے کے مطابق اِس غزل کے سب قافیوں کے آخر میں الف لکھا جائے گا۔ یعنی جن لفظوں کے آخر میں ہائے مختفی ہوگی اُن میں ہ کی جگہ الف لکھا جائے گا۔ اصل لفظ ''اشارہ'' ہے، اِسی طرح لکھنا چاہیے؛ یہاں چوں کہ یہ ''جتنا'' کے قافیے میں آیا ہے، اِس لیے اِس غزل میں اِسے ''اشارا'' لکھا جائے گا۔

تلفّظ کے بیان کو اب ختم کیا جاتا ہے۔ لکھنے کو تو بہت کچھ ہے، مگر بات گنجایش کی ہے۔ اصل مقصد یہ تھا بھی نہیں کہ بہت سی مثالیں جمع کی جائیں۔ اصل مقصد یہ تھا کہ اِس طرف متوجّہ کیا جائے کہ لفظوں کے املا کے ساتھ ساتھ اُن کا صحیح تلفّظ بھی معلوم ہونا چاہیے۔ لغت دیکھنے کی عادت ڈالنا چاہیے اور جاننے والوں سے پوچھتے بھی رہنا چاہیے۔

الفاظ کا املا

اِس ضمیمے میں ایسے لفظوں کو شامل کیا گیا ہے جن کے املا کے متعلق طالب علموں کے دل میں کسی طرح کا شک پیدا ہو سکتا ہے، یعنی یہ کہ اِن کو کیسے لکھا جائے۔ بعض لفظوں کے سامنے اُن کے معنی بھی لکھ دیے گئے ہیں۔ اور جو لفظ دو طرح لکھے جا سکتے ہیں، اُن کی دونوں شکلوں کو ایک جگہ لکھ دیا گیا ہے۔

آبا (آب کی جمع) باپ دادا
آبا و اجداد (باپ دادا)
آبائی (خاندانی، موروثی)
آبگینہ
آبلہ
آبنائے
آب و دانہ
آب و دانے کی بات
آپ ہی آپ۔ آپی آپ
آثم (گنہ گار)
آغاہ۔ آخاہ
آخُور (وہ گھاس جو گھوڑوں کے کھانے سے بچ رہتی ہے اور نکال کر پھیلا دی جاتی ہے۔ نکمّا، خراب، بے کار)
آخوند (اُستاد)
آذر (آگ)
آذربایجان
آرایش
آرایشی
آرٹکل

آریا
آزر (نام)
آزمایش
آزمایشی
آزوقہ (تھوڑی سی غذا)
آسایش
آسیا (چکّی)
آسیہ (فرعون کی بی بی کا نام)
آشکارا (ظاہر)
آگرہ
آلایش
آلہ (جمع: آلات)
آلا (کچّا زخم)
آلھا اودل
آملہ
آموختہ (پڑھا ہوا، پچھلا پڑھا ہوا)
آنسو، آنسوؤں
آنو
آنتی پانتی
آنولا
آئینہ۔ آئنہ

آوا (پزاوہ)
آوازہ (شہرت)
آویزہ (کان کا زیور)
آہا۔ آہا
آئین (قانون، رسم و رواج، طرز و روش)
آئیے (آ، ءِ، یے)
آیندہ
آیہ (آیت)
آیے (''آیہ'' کی جمع)
آیت
اِبتذال
اَبرہ (دُہرے کپڑے یا روئی والے کپڑے کی اوپری تہ)
اَبلہ (بے وقوف)
ابوذر (ایک صحابی کا نام)
ابیر (ابیر۔ گلال)
اُپائے
اُپلا
اتا پتا
اُتارا
اُتار چڑھاو

اُتاولا، اُتاولی
اَتائی (جس نے کسی پیشے والے کا ہُنر شوقیہ سیکھا ہو، خاندانی پیشہ ور نہ ہو جس نے کوئی ہُنر یا فن باقاعدہ نہ سیکھا ہو)
اَتھاہ
اَٹکاو (حاصل مصدر)
اَٹکاؤ (اٹکانا کا فعل)
اَٹلس
اٹھارہ
اٹھارواں
اٹھارویں
اٹھاروں
اُٹھائی گیرا
اٹھتّر
اٹھوانہ!
اَثاثہ
اِجارہ
اِجرا
اِجرائے ڈگری
اچمبھا
اِحتراز

اَحیاناً
اَخاہ
اِداریہ ۔اداریے،اداریوں
اُدَبا (ادیب کی جمع)
اَدعیہ (دُعا کی جمع)
اَدلا (تانگ کا بے ریشہ گوشت)
ادلا بدلا
ادنا
ادوان، ادوائن
اَدوِیہ (دوا کی جمع)
اَدھن
اَدھنّا
اَدھیلا
اِڈیٹر
اِڈیسن
اِڈیشن
اِڈیشنل
اِذعان (یقین کرنا)
اَذفر
اَذکار (ذکر کی جمع)
اذیّت
اِرتباط (میل جول)
اِرتحال (مرجانا)
اِرث (ترکہ)
اَرذَل (بہت ذلیل)
اَرغوان (سرخ رنگ، سرخ پھول)
ارگجا
اَزلی
اڑتالیس

اڑتیس
اَڑھتیا
اَڑھیّا
اَڑیل
اِزالہ
اِزدحام
اَزرَق (نیلا رنگ۔ وہ شخص جس کی آنکھ کنجی ہو۔)
اَزہر (بہت روشن)
اژدہا
اژدھات
اسپیشل
اُسترہ
اسحاق
اَسرار (سِرّ کی جمع، بھید)
اسکول
اسماعیل
اَش اَش
اِشاریہ، اِشاریے، اشاریوں
اُشتُلّا
اصالت
اِصرار (تاکید، ضد، تکرار)
اُصطُرلاب
اِصطَبل۔ اَصطَبل
اَصلا (ہرگز، کسی طرح)
اِضطرار (بے اختیاری، بے قراری)
اِضمحلال

اِطریفل
اطلس (ایک ریشمی کپڑا)
اِعتِذار
اُعجوبہ۔ عجُوبہ
اَعزا۔ اَعزہ
اعلا
اِغماض
افزائش
اُفوہ
اَقصا
اِکّا
اک درا
اکسپورٹ
اکسٹرا
اک منزلا
اکّیس
اگرئی
اِگزامز
الاچی۔ الائچی
اَلاو
اُلجھاو (حاصل مصدر)
اُلجھاؤ (الجھانا کا فعل)
اِلحاج
اَلحَذَر
السیشین
الغوزا
اَلف لَیلہ
اللہ
اِلٰہ
اِلٰہی
اِلٰہیات

الٰہیہ
اِمالہ
امام باڑا
امانتاً
امبالہ
امبر
امپائر
امپورٹ
امپیریل
اَمۃُ الزّہرا
اَمچور
اِمراوتی
امروہہ
اَنَا البحر
اَنَا الحق
اُناسی
اُنتالیس
اُنتیس
اُنمنی
اِندرائن۔ اِندرائن
اَندرسا
اَندوہگیں
انشائیہ۔ انشائیے
انگارا
انگیا
اُنہتّر
اُولوالاَبصار
اُود بلاو
اَولا (بہتر، بہت مناسب)
اُولا

ایجوکیشن
ایجی ٹیشن
ایڈرس
ایڈوکیٹ
ایڈی کانگ
ایذا
ایبریبر

بابت
باٹ (وزن۔ راستہ)
باجا
باجپئی
باجرا
بارہ۔ بارھوں، بارھواں
بارھویں، بارھوِیں
باڑا
بازو۔ بازوؤں
باشہ (شکاری پرند)
بانٹ، بانٹنا
بانہہ۔ بانہیں
باد (ہوا)
بادگولا (قولنج کا درد)
باولا، باولی، باولے
بائبل
بائیس
بائیسکل
بائکاٹ
بتاشا
بتّیس
بتّا
بتائی، بٹوارا

بجائے
بجرا
بجز
بچارا
بے چارہ، بے چارگی
بچاو
بچاؤ (فعل)
بچکانا
بچھو، بچھوؤں
بچھوا، بچھوے، بچھووں
بخشایش
بخیہ، بخیے
بدرُ الدُّجا
بدلا
بدپہ
بُذل
بَذلہ
برات
بُرادہ
برامدہ
بَرائت
برائے (برائے خدا)
برتا
برتاو
برخاست۔ برخاستگی
بَرزَخ
بَرص کے داغ
بُرقع۔ برقعے، برقعوں
برقنداز
برگا
بریگیڈیر

برہا
بڑھئی
بزّاز، بزاز
بُزدلا
بزربا
بستہ
بسوا
بسولا
بعینہٖ
بغیا
بفضلہ
بقاءاللہ
بُقچہ
بقیّہ
بکاولی
بکاؤ (بِکاؤ)
بگلا
بگولا
بَلّا
بِلّا
بُلبُلا
بمبوق
بناؤ (فعل)
بناؤ (بناء و۔ بنانے والا)
بناو (حاصل مصدر)
بناوسنگار
بنجارا
بُندا
بندہ۔ بندگان، بندگی
بنگلا
بنگلیا

بُنّا
بَنّا
بنولا
بنہگی
بنیا۔ بنیے۔ بنیوں
بوا
بوانا
بورژوا
بھابی
بھارتیہ
بھالو۔ بھالوؤں
بہاو (جیسے دریا کا بہاو)
بہاؤ (فعل)
بھاو تاو
بہاءالدین
بہاءاللہ
بھبھڑ
بھبھک، بھبھکنا
بھبھکا، بھبھپکا
بھبھوت
بھبھوکا
بھپارا
بھتّا
بُھتّا
بُھتیا
بُھتنی
بھٹّی
بھٹیارا
بُھجنگا
بھُجیا
بھراو (جیسے دیوار کا بھراو)

بھراؤ (فعل جیسے لحاف بھراؤ)
بھروپیا۔ بھروپیے، بھروپیوں
بھروسا
بہ شرطے کہ
بھقر بھقر
بھکاری
بھگتیا۔ بھگتیے
بھل بھل
بھل بھلانا
بھل منسئی
بھنبوڑنا
بھنبیری
بھنکنا، بھنکوانا، بھونکنا
بھو۔ بھوئیں۔ بھوؤں
بھوبل
بھوچکا
بھوسا
بھوں، بھویں، بھووں
بھونپو
بھونچال
بھئی (بھائی کا مخفف)
بھتیا۔ بھتیے
بھیجا (مغز، سر)
بھینچنا
بھیک
بیپار۔ بیوپار
بیپاری۔ بیوپاری
بیچ بچاو
بیر
بیرون جات

بیڑا
بیپڑا
بیشہ
بیضا (روشن، سفید)
بیضہ (انڈا)
بیلا (گجرات، ایک باجا، ایک خوش بو دار پھل۔ وہ جنگل جو دریا کے کنارے ہو)
بے مایہ
بے مایگی
بیورا
بیوہار

پائتابہ (وہ چمڑا جسے جوتے میں رکھتے ہیں)
پارا (سیماب)
پارچہ جات
پارلی منٹ
پارہ (ٹکڑا، ریزہ)
پارینہ (پرانا)
پاڑ
پالا
پالیسی
پانسا
پانو۔ پانوؤں
پائنیر
پاؤ (فعل)
پاو (سیر کا چوتھائی حصہ)
پاو بھر، پاو سیر

پائنتی
پائنچا
پائیے (پاءِ یِ ے)
پائے بند۔ پابند
پائے بوس۔ پابوس
پائیتابہ۔ پاتابہ
پائے تخت
پائیجامہ۔ پاجامہ
پائیدار
پائیداری
پائے دان۔ پایدان
پائے گاہ۔ پایگاہ
پائل۔ پایل
پائے مال
پائندہ۔ پائندگی
پایہ۔ پایے۔ پایوں
پبلشر
پپوٹا
پپیتا
پتا
پُتا
پِتّا
پُتلا
پتنگا
پتھراو
پتیلا
پُٹّا
پٹّا (تسمہ جو پالتو جانوروں کے گلے میں ڈالتے ہیں، وہ دستاویز جو کاشتکار زمیندار کو لکھ کر دیتا ہے

ٹھیکے داروں کی دستاویز)
پٹاخا
پٹارا
پٹاو (جیسے زینے کا پٹاو)
پٹاؤ (پٹانا کا فعل)
پٹکا
پٹھا
پٹوا
پیچ درا
پیچ گوشیا
پیچ لڑا
پیچ محلا
پیچ منزلا
پچارا (برش، کوچی، دھوکا)
پچانوے
پچاسی
پچھتانا
پچھتاوا
پچھوا
پچھیاو
پچھوانا (دریافت کرانا)
پذیر۔ پذیرفتن
پذیرا
پذیرائی
پڑا (محلہ، بستی)
پُڑا
پرارتھنا
پراگندگی
پراگندہ
پرائمری

پراوٹ
پُربیا۔ پُربیے
پُرنلا
پرچہ
پرچھاواں
پرچھائیں
پردہ
پُرس
پرکالہ
پرگنہ
پرمیشور
پرنالا
پِروا
پُروا
پروانہ جات
پروفیسر
پریسیڈنٹ
پریکٹس
پڑاقا
پڑاو
پڑوا
پڑوس
پڑوسی
پُڑیا
پژمردہ
پستہ
پستئی
پسندا
پسنگا
پسینا
پشتارہ

پُشتہ
پشمینہ
پشواز
پشّہ (مچھر)
پلّا
پِلّا
پلاو
پلاؤ (پلاوُ۔ پالتو)
پلندا
پلّو۔ پلّوؤں
پلّہ (درجہ، مرتبہ، ترازو کا پلّہ)
پلیا
پنّا
پنبہ (روئی)
پن بھتا
پنچایت
پنچایتی
پن سیرا
پوائنٹ
پوتا
پوٹا
پوچھنا
پولٹیکل
پونچھنا
پہاڑا
پھانس
پھانسی
پھاوڑا
پھاہا
پھپھس

پھپھولا
پھپھوندی
پھٹ پھٹانا
پھٹ پھٹیا
پھد پھدانا
پھر پھرانا
پھرہرا۔ پھریرا
پھریری
پھڑ پھڑانا
پھل جھڑی
پہلو۔ پہلوؤں
پہنچ
پہنچنا
پہنچا
پہنچی
پھنسنا، پھنسانا
پھنسوانا۔
پھنکنا، پھنکوانا، پھینکنا
پھینک پھانک
پھنکنا، پھنکوانا،
پھونکنا۔
پھنکنی

پھُکوا
پھُوار
پھوپا
پھوپی
پھوہڑ
پہیا۔ پہیے۔ پہیوں
پھیکا۔ پھیکی
پیادہ

پیالہ
پیاؤ (پیاءُو)
پپیہا
پیتابا
پیترا
پیدائش
پیرایہ۔ پیرایے۔ پیرایوں
پیپا
پیمائش
پینتالیس
پینتیس
پینٹھ
پیے، پیو، پییں

تارا
تازیانہ
تاشا
تالا
تانگا
تانے تشنے
تاو (حرارت، غصہ وغیرہ)
تاؤ (تاءُو) چچا
تاؤ (تاءُو۔ تانا، کا فعل)
تبادلہ
تبارا (تیسری بار)
تباشیر
تبرا
تپاں
تپش
تپنچہ
تتمہ

تثنیہ
تجزیہ - تجزیے
تحت الثریٰ
تحشیہ
تخئیل
تذبذب
تراہا
تربولیا
ترکی
تراق پڑاق
تڑاقا
تزکیہ
ترپن
تسالا
تسامح
تساہل
تسلا
تسمہ
تشت
تشتری
تصحیح
تصفیہ - تصفیے
تضحیک
تفنیخ
تعالا
تعریض
تعزیہ - تعزیے
تعویذ
تعیّن
تغیّر
تقاضا

تقوا
تکا بوٹی
تُکّا
تکونا
تکونیا
تکُنیا
تلاطم
تلاو (تالاب)
تلمیذ (شاگرد)
تلوا، تلوے، تلووں
تکواں
تماچا - تمانچا
تماشا
تمتاہا
تمباکو
تمبو
تمغا
تمنچا
تمتمرا
تمیز
تمیزن (نام)
تناو
تنبورہ
تنبیہ
تنکا
تنہ
توّام
توبڑا
توبہ
توتا
توتیا

توجیہ
تودہ
توشہ
تولا
تولیا - تولیے - تولیوں
تہ
تہ کرنا
تہ دار
تھانا
تھاہ
تھتانا
تھتکار
تہران
تہس نہس
تھکا ماندا
تھک تھکانا
تھگلی
تہماسپ
تہمد - تہ بند
تھوا، تھوے، تھووں
تھوتن
تھوہڑ
تہیّہ
تیار - تیاری
تیجا
تیتالیس
تینتیس
تیرہ (۱۳)
تیرہ (سیاہ)
تیرہ وتار
تیشہ

تیغا
تیوری
تیوہار
تیہا
تیئیس

ٹانکا
ٹانکنا، ٹنکانا، ٹنکوانا
ٹنکائی، ٹنکوائی
ٹائل
ٹائیٹل
ٹٹ پونجیا، ٹٹ پونجیے
ٹٹھنا
ٹرخانا
ٹرکانا
ٹیڑھ منہا
ٹھستا
ٹکا
ٹکاو (ٹکاؤ)
ٹکاو (ٹکاؤ - ٹکانا سے فعل)
ٹکراو
ٹکیا
ٹوٹکا
ٹولا (محلہ، بستی)
ٹھاٹ
ٹھاٹر
ٹھانسنا - ٹھونسنا
ٹھنسنا، ٹھسنا،
ٹھنسوانا، ٹھسنا۔
ٹھونس ٹھانس

ٹھانو (جگہ)
ٹھپا
ٹھٹ
ٹھٹھرنا
ٹھٹکنا
ٹھٹول
ٹھٹیرا
ٹھنڈ - ٹھنڈا
ٹھوکنا (مارنا)
ٹھونٹ
ٹھونکنا، ٹھنکنا
ٹھنکوانا
ٹھہراو (حاصل مصدر)
ٹھہراؤ (ٹھہرنا کا فعل)
ٹھہرنا
ٹوہ
ٹہوکا
ٹھیٹ
ٹھیکرا
ٹھینٹی
ٹپکا
ٹیلی ویژن
ٹیاں

ثقہ
ثناء الحق
ثناء اللہ

جاذب
جانچ، جانچنا، جنچنا،
جنچوانا

جانگ
جانگیا، جانگیے
جب کہ
جبہہ (پیشانی)
جتھا
جذام (کوڑھ)
جذامی
جذب
جذبہ
جذر (حساب کی
اصطلاح)
جرأت
جرح
جرگہ
جرعہ (گھونٹ)
جڑاو (جڑاؤ زیور)
جڑواں
جز
جزر (سمندر کے پانی
کا اُتار)
جزو - جزوی
جزیہ
جغرافیہ
جگن ناتھ
جگہ
جلاہا
جمال گوٹا
جماو (لوگوں کا جماؤ ہے)
جماؤ (فعل)
جماہی
جمعیت

جنیو
جُوا
جَوا
جوار
جُواری
جوالا
جوڈیشل
جونیر
جوئندہ
جھابا
جھانجن
جھانج
جھانسا
جھانکنا، جھنکوانا
جھانواں
جھجر
جھجک - جھجکنا
جھرجھرا
جھرجھری
جھروکا
جھکاو (دُن کا جھکاو
کدھر ہے؟)
جھکاؤ
جَھل جَھل
جُھل جُھل
جَھل جَھلانا
جھما جھم
جھنجری
جھنجھلانا
جھنجھلاہٹ
جھنجھوڑنا

جھن جھنانا
جھن جھنا
جھنجی
جھوٹ
جھونپڑا - جھونپڑی
جھوسج
جھونجل
جھونک، جھونکنا،
جھونکا
جھپکنا
جئی
جیب (زبان)
جیب
جیا، جیسے، جیو، جیں

چادرا
چارا (جانوروں کی خوراک
مچھلی کا چارا)
چارہ (تدبیر، علاج)
چاقو - چاقوؤں
چالیس
چانپ
چانٹا
چاو (ارمان، نازنخرا)
چاولا (جیسے امرناتھ چاولا)
چاؤں چاؤں (شوروغل)
چائے
چبوترا
چپینا
چٹخارا
چٹکلا

چرائند
چُربہ
چرخہ
چرکا
چڑھاو (اُتار چڑھاو)
چڑھاؤ (چڑھانا کا فعل)
چسکا
چُغا
چَلتا
چَکلا
چَکما
چکنئی
چَکوتا
چَکئی
چِلّا (کمان کا۔ انڈے کا چلّا)
چلغوزہ
چلّہ (۴۰ دن کی مدّت)
چنبل
چپّا
چمپئی
چل چلاؤ
چمپئیں
چمچہ
چُنّاں چر
چُناو
چندا (چاند)
چندہ مانگنا
چوالیس
چُوانا
چو بغلا

چَوبارا
چوپایہ، چوپایے، چوپایوں
چُوپڑا (جیسے لشن لال چوپڑا)
چَوحدّا
چَوراہا
چَورستا
چَوڑاو
چوزہ
چَوطرفا
چَوکا
چَوگوشیا
چَومحلا
چُونا (کتھا چونا)
چونتیس
چَونپال
چون کہ
چھاپا
چھاپہ چھ
چھالا
چھالیا
چھانٹنا، چھنٹنا، چھنٹوانا، چھنٹائی
چھنٹاو
چھانو
چھاونی
چھٹنا (جیسے: بادل چھٹنا)
چھجّا
چھچلا

چھچورا
چھچھوندر
چھِچھِڑا، چھچھڑے
چھِڑکاو
چھتنا چھتنئی
چھنٹاو
چھننا، چھاننا
چھوا، چھوئی، چھوئے
چھوئی موئی
چھوارا
چُھوانا، چُھوائی
چھوچک
چھٹے
چھپّتر
چھپکلی؍چھپکالیدر
چیدہ
چیرا (پگڑی)
چیرہ (غالب)
چَیلا (لکڑی کا)
چیلا

حاذق
حامی (مددگار)
حائل
حُجرہ
حجلہ (دُلھن کا چھپر کھٹ)
حجم
حدیقہ
حذر
حذف

خربہ
حِرز (تعویذ)
حریرہ
حزیم
حُزن
حِصار (قلعہ)
حِصص (حصّہ کی جمع)
حصّہ بخرہ
حَضَر ("سفر" کی ضد)
حضیض (گڑھا، نشیب)
حظ
حَظیرہ (قبرستان کی چہار دیواری)
حلوا
حلوائے سوہن
حُلیہ
حمائل
حمایتی
حوالات
حوالہ جات
حوض
حوضہ (ہاتھی کی عماری)

خاکسار
خاگینہ
خالو۔ خالوؤں
خُتکا
خدمت گزار
خدیو
خُرد (چھوٹا)
خُردہ، ریب، ریزگاری (بکرا)

خرسند
خرّم، خرّمی
خُربا
خریطہ
خزف
خسارہ
خستہ
خمیازہ (انگڑائی، بدلا، پشیمانی)
خواستگار
خوانچہ
خواہ مخواہ
خوب تر
خوش خط
خوشنود۔ خوشنودی
خوشہ
خوض (غور و خوض)
خوناب (آبِ خون)
خویش
خیّاط (درزی)
خیر سلّا
داخلہ
دادرا
داروغہ
داعیہ
دانا (عقل مند)
دانہ
دانتا کِل کِل
دانو
داہنا
داتر

دائرہ
دائم
داؤد
دائیں بائیں
دباو (حاصل مصدر)
دباؤ (فعل)
دبدبہ
دُبدھا
دَتّا (جیسے: برنزاین دتّا)
دَدوا
دُدّھی
دَرپے
درجہ
درخواست
درگذر کرنا
درماہہ
دُرّہ (چمڑے کا کوڑا)
دَرّہ۔ درہ (گھاٹی)
دریا
دریچہ
دریز (کپڑا)
دربسی
دُڑھیل
دَڑیرا
دساوری
دستانہ
دستہ
دسہرا
دعوا
دعوے دار
دغدغا (چھوٹی قندیل، دمکتا ہوا)

دغدغہ (خوف)
دفعتًا
دفعہ
دفعیہ
دفینہ
دقیقہ
دُگنا۔ دُوگُنا
دل آرا
دل آرام
دل آویز
دُلارا
دِلاسا
دُلائی
دلائل
دل پذیر
دل دادہ
دل دار
دل داری
دل رُبا
دل ستاں
دل کش
دل کشا
دُلھن
دلیا
دُنبہ
دندانہ
دوآبہ
دَوات
دُوار
دِوالا، دوالیا، دوالیے
دوآتی

دوبارہ
دوبالا
دوپٹّا
دوپلی
دوپلّی
دوپیازہ
دوچار
دورُخا
دَور دورا
دورنگا
دورُویہ
دُوسا
دوسالہ
دوسوتی
دوشاخہ
دوشالہ
دوشنبہ
دوطرفہ
دوغلا
دوفصلا
دوگانہ
دوگونہ
دومحلا
دومنزلا
دومُنہا
دَونا
دُونا
دونسلا
دونوں
دوہترہ
دوہتی

دہات ۔ دیہات
دَہانہ
دُہائی
دھبّا
دھچکا
دُہرا ۔ دُہری
دُہرانا
دَہرہا ۔ دَہرے
دَھل دَھلانا
دہلیز
دُھند
دُھندلا
دُھندلکا
دُھواں
دُھواں دھار
دُھواںتا
دُھوپیں
دَھونکنا
دَھونکنی
دِیا (چراغ)
دیجیے (دی ج ی ے)
دیجیو
دیدہ و دانستہ
دیرینہ
دیکھیے (دیکھ ی ے)
دیگچہ
دیو
دیوتا
دیو کی نندن
دیوتی
دیوث

دِیے (دِی ے) دینا کا فعل)
دِیے (دِی ے) دِیا (چراغ) کی جمع)

ڈاکا
ڈاکو ۔ ڈاکوؤں
ڈاکیا ۔ ڈاکیے ۔ ڈاکیوں
ڈانٹ ۔ ڈانٹنا
ڈانواڈول
ڈائرکٹر
ڈبّا
ڈباؤ (ڈ ب ا ؤ) (پانی
ہاتھی ڈباؤ ہے)
ڈبیا
ڈپارٹ منٹ
ڈپازٹ
ڈپو
ڈراما
ڈراونا
ڈرائور
ڈزائن
ڈکوٹا
ڈلا
ڈلیا
ڈنکا
ڈوریا
ڈولا
ڈونگا
ڈویژن
ڈھاٹا

ڈھادینا
ڈھانا
ڈھانپنا
ڈھانچا
ڈھانکنا
ڈھکن، ڈھکنا، ڈھکنی
ڈھکوسلا
ڈھلاو
ڈھونڈنا
ڈھیٹی دینا
ڈھیّا
ڈھیٹ
ڈھینکلی
ڈیرا

ذات
ذائقہ
ذبیحہ
ذخیرہ
ذرا
ذرّہ
ذرّیت
ذقن
ذکا
ذکاوت
ذکاءاللہ
ذکی
ذکیہ
ذم
ذمّہ، ذمّے
ذمّے دار

ذوالجلال
ذوالفقار
ذوالقرنین
ذومعنیین
ذومعنیٰ
ذیابیطس
ذی شان

راجا
راجیشور
راجیہ سبھا
راستہ
راشٹریہ
رامائن ۔ رامائن
راو (جیسے: راماراو)
راوی
راہ گذار
راہ گذر
رائتا
رائٹر
رائفل
رائے
رائے بہادر
رائے بیل
رایگاں
رُپہلا
رُپہلی
رُتوندھا
رجواڑا
رحمان
رحمت

رحمۃ اللعالمین
رُخصتانہ
رخنہ
ردّا
رذالا
رذالت
رذیل
رزمیہ
رزولیوشن
رزیڈنٹ
رزیڈنسی
رستہ
رسوئی
رسوئیا
رضاعت (بچوں کو دودھ پلانا)
رضاعی بھائی (دودھ شریک بھائی)
رضوان
رطب و یابس
رعایتی
رفت و گذشت
رُقعہ
رُکاو
رکشا
رُمالی (پاجامے کی)
رمنا (چراگاہ)
رنڈسالا
رنڈوا
رُواں ۔ رواں
روئیں دار

روانسا
روپیا ۔ روپے
روزنامچہ
روزینہ
روضہ
روکھا
رُکھائی
روتا
رومال
رومالی روٹی
رومالی سوئیاں
رومۃ الکبرا
رونگٹا
روداد ۔ رویداد
رویّہ
رہایش
ریڈیکل
ریزگاری
ریہم

زاویہ
زائچہ
زائر
زبرجد
زبور
زبوں
زٹل
زٹلی
زُجر
زچّہ
زخّار (بحرِ زخّار)

زرتشت
زردا
زکات
زکریّا
زُلال
زنّار
زنانا (زنخا)
زنانہ مکان
زنجیرہ
زنخا
زہرا (حضرت فاطمہ کا لقب)
زہراب
زہر مُہرہ
زہرہ (ایک ستارہ)
زَہرہ (پتّا)
زیبایش
زیرہ

ژالہ (اولا)
ژرف (گہرا)
ژولیدہ (الجھا ہوا، پریشان)

سابودانہ
ساٹن (کپڑا)
سادھو ۔ سادھوؤں
سالگرہ
سالنامہ
سانپ
سانٹھ

سانٹھ گانٹھ
سانٹھنا
سانچا
سانجھ
ساہتیہ
سانڈ
سائکل
سایا (ایک پوشاک)
سایبان
سایہ ۔ سایے ۔ سایوں
سبا (ملکہ بلقیس کے پایۂ تخت کا نام)
سُبحہ (تسبیح)
سَبع (سات)
سبھاو
ستارہ
ستاپس
ستایش
ستایشی
ستّرہ
سترھواں ۔ سترھویں
سترھوں
سُتواں
ستوانسا
سُتھراو
ستیہ جیت
ستیہ کام
ستیہ گرہ
ستّا
سحاب (بادل)
سُدّہ

سُدھ بُدھ
سرائے
سردہ (ایک پھل)
سِرکہ
سَرگذشت
سرمایہ ۔ سرمایے
سرمایہ دار
سُرمگیں
سُرمہ
سُرمئی
سِروا
سروتا
سرھانا، سرھانے
سَفرہ
سِفلہ
سقّا
سکتہ
سکورہ
سِکّہ
سُلفا
سوداسلف
سلما
سلیمان
سما (آسمان)
سماں
سمبھل
سمجھوتا
سمتن
سِن (عُمر)
سموسا
سُناونی

سنپولا
سنپولیا
سنپیرا
سنترا
سِنچائی
سِنچنا
سِینچنا
سندیسا
سنکائی، سِنکنا،
سِنکوانا، سِینکنا
سینک ۔
سنہ
سُوا، سوئی، سوئیاں
سوارت
سِوائے
سُوتا (سُوت)
سوچنا
سُوَر
سولہ، سولھواں،
سولھویں،
سولھوں
سِوَیّاں
سووی نیر
سوٗء (بُرا)
سوءِ اتفاق
سوءِ ادب
سوءِ ظن
سوءِ ہضم
سوئمبر
سَہہ (سہنا کا فعل امر)
سہائے (رام سہائے)

سہاۓ ۔ سہایک
سَہو
سِیا، سیے، سیّیں
سِیو
سَیّآت
سیّارہ
سیپارہ
سیدھا سادھا
سیسا (ایک دھات)
سیکڑا، سیکڑے
سیکڑوں
سینتالیس
سینتیس
سِینٹھا
سیندور
سینیر

شاخسار
شاخسانہ
شاذ
شاستر ۔ سنگیت
شالا (پاٹھ شالا)
شامیانہ
شائبہ
شاید
شائستہ ۔ شائستگی
شائگاں
شب خون
شُبہہ ۔ شُبہ
شتابا
شحنہ (کوتوال)

شدّا
شرمگیں
شصت (ساٹھ)
شطرنج
شِکارا
شکرانہ
شکرانا (سادہ چاولوں کا شکر اور گھی ملا ہوا)
شِکرہ
شکرپارا
شکرخورا
شُکرگزار
شکریہ ۔ شکریے
شلوکا
شلپتا (ٹاٹ کا بڑا تھیلا)
شمبھو
شمس الضحیٰ
شمس الہدیٰ
شِوالا
شُورا (مجلس شوریٰ)
شوربا
شورہ پشت
شُہدا (شہید کی جمع)
مُجہدا
شُہرہ
شَے
شیمی خورا
شیرہ
شیکسپیر
شیوا (شیوا بیان)

شیوہ (طور طریق، انداز)

صابن
صافا
صاعقہ
صبا
صبح خیز یا
صبح دم
صد (سو)
صرّاف
صرصر
صرع (مرگی)
صرپر (قلم چلنے کی آواز)
صُغرا
صفیر (آواز سیٹی کی آواز)
صلات (نماز)
صُمٌّ بُکمٌ
صمصام (تلوار)
صمیم (خالص، سچا)
صنادید (بزرگ لوگ سردار)
صواب (درست)
صواب دید
صوبہ جات
صَوت (آواز)
صوفیہ (صوفی کی جمع)
صَومعہ
صیّاد
صید (شکار)

ضائع

ضخامت
ضخیم
ضَرر
ضَرغام (شیر)
ضرورتاً
ضریح
ضلالت (گم راہی)
ضیافت
ضیاء اللہ
ضیاء الدین
ضیغم (شیر)
ضَیف (مہمان)
ضیق (تنگی)
طالب علم
طائر
طبلہ
طرفۃ العین
طَلَبہ
طمطراق
طنطنہ
طوبیٰ
طوعاً کرہاً
طومار
طویلہ
طیّار (اڑنے والا)
طیّارہ
طیش
ظِل (سایہ)

عاشورا
عائد

عبادت گزار
عبداللطیف
مُجوبہ (اعجوبہ)
عِذار (رُخسار)
عَذرا
عِذوبت
عظما
عظیمن (نام)
عُقبا
علاحدہ ۔ علاحدگی
علاقہ جات
علاء الدین
علَی الصّباح
علَی العُموم
علیمن (نام)
علیٰ ھٰذا القیاس
عَمرو (نام)
عُمر (نام)
عیسا ۔ عیسیٰ
عیسائی

غارت گر ۔ غارت گری
غازہ
غازی پور
غالیچہ
غائب
غُبارا
غتربود
غمّا
غرارہ کرنا
غرارا (ایک زنانہ پوشاک)

غرض کہ
غُرفہ (جھروکا)
غرّہ (مہینے کا پہلا دن ۔ فاقہ)
غَرّہ (غرور)
غَلّا
غلتاں
غلط نامہ
غُلغُلہ
غلّہ
غمّاز
غیظ
غیظ و غضب

فاحش غلطی (شرم ناک غلطی، بڑی غلطی)
فاش غلطی (کھلی ہوئی غلطی)
فالسہ
فالسئی
فال نامہ
فارسز
فائق
فتوا
فتیلہ ۔ فلیتا
فتیپن
فرما
فرمایش ۔ فرمایشی
فطرتاً
فِطرہ
فطین (دانا، ذہین)

فقہ
فقیہ
فلیتا۔ فتیلہ
فن کار
فہمایش
فی البدیہہ
فیتا
فیروزہ
قافیہ، قافیے
قائل
قائم
قتلا
قدرتاً
قرائت۔ قرءت
قرطاس
قرعہ
قرنا
قریہ
قزاق
قسائی
قشقہ
قصاب
قصاص
قصص (قصہ کی جمع)
قطامہ
قفس
قلم کار
قلیہ
قمقمہ
قمیص
قنات

قوا (قوت کی جمع)
قورما
قہقہہ
قیف
قیلولہ
قیمہ
قے

کاٹ چھانٹ
کاٹھ کباڑ
کاذب (جھوٹا)
کارگزار۔ کارگزاری
کاسہ (پیالہ)
کاشکے
کاگا (کوا)
کالک
کاما
کان پور
کانسا (ایک دھات)
کانسٹی ٹیوشن
کائنات
کایستھ، کالستھ
کباڑیا، کباڑیے
کبرا
کپڑا لتا
کتھا
کتھا
کٹاو (دریا کا کٹاو)
کٹرا (محلہ)
کٹورا
کچا ہند

کچلا (ایک دوا کا نام جو زہر ہے)
کچھوا، کچھوے، کچھووں
کرانا
کرانچی (اسباب لادنے کی گاڑی)
کرایہ، کرایے، کرایوں
کرتوت
کرتا
کردا (کٹوتی)
کرگھا
کرم کلا
کریلا
کرید
کڑا اڑا
کڑھاو (بڑی کڑاہی)
کژدم (بچھو)
کسالا
کسٹوڈین
کسرت
کسنئی
کشایش
کلاسکی
کلا شجرا
کلاوہ
کلہاڑی
کلبہ
کلچہ
کلسا
کلیجا
کلپسا

کلیہ
کموہ
کم خواب (ایک کپڑا)
کمرا
کملیشور
کنارہ
کندا (بندوق کا۔ پابجامے کی لمبی تین گوشوں کی کلی)
کندہ (کھدا ہوا، نقش کیا ہوا)
کندہ (موٹی لکڑی کا ٹکڑا)
کنکوا، کنکوے، کنکووں
کنگرہ
کنگورا
کنگھا
کنوارا، کنواری، کنواریوں
کنواں، کنویں، کنووں
کنیاں
کنور
کنیہ
کوا، کووں
کواٹر
کوپل
کوکا
کونچ (وہ موٹا پٹھا جو آدمی کی ایڑی کے نیچے اور چارپایوں کے ٹخنے کے نیچے ہوتا ہے کونچیں کاٹنا)
کوندا
کہہ ("کہنا" کا فعل امر)

کھاتا
کھاجا
کھانپ
کھانچا
کھانسنا
کھتا
کھروسنچا
کھڑانو۔ کھڑانویں،
کھڑانوں
کھڑوا، کھڑوے، کھڑوں
کھس پھس
کھسر پھسر
کھک
کھکل
کھکوڑنا
کھکیڑ
کھمبا
کھنچنا، کھنچانا، کھنچوانا
کھنچاو
کھنچاوٹ
کھنکارنا
کھنکنا
کھن کھنانا
کھونپ
کھونٹا
کھونچا
کھونسنا
کھینچنا
کیا، کیے
کیاں
کیجیے (ک ی ج ی ے)

کیچوا
کیسہ
کیشیر
کیلا
کیمپ
کیچلی
کیوڑا
کیوں کہ
کیونکے (کیوں کر)

گانجا
گانٹھ، گانٹھنا
گانو۔ گانوؤں
گاو (گاے)
گاو (گانا کا فعل)
گاودی
گاے، گائیں، گایوں
گاہک، گاہک
گتا
گتکا
گتھنا، گتھوانا، گتھواں
گتھ جانا
گٹا
گٹکا
گٹھا
گٹھاو
گٹھنا، گٹھانا، گٹھوانا
گٹھائی، گٹھوتی گٹھوائی
گجی
گذاشتن (چھوڑنا)
گذراں (گزرتا ہوا)

گذرگاہ
گذشتن (گزرنا)
گذشتگان
گذشتہ
گرستی، گرستن
گرمایش
گروی
گریجویٹ
گزڑیا۔ گنڈریا
گزارا
گزاردن (ادا کرنا، پیش کرنا)
گزارش
گزارنا
گزران
گزربسر
گزرنا
گزرانا
گکھرو۔ گوکھرو
گلائی، گولائی
گلاوٹ
گل بدن
گل رخ
گل رنگ
گل فام
گل قند
گلگلا
گلا
گلہ (شکایت)
گلہ
گملا

گنجایش
گندا (غلیظ، ناپاک)
گنڈا
گنڈاسا
گنیا
گوالا
گوتھنا
گورکھ دھندا
گوش گزار کرنا
گولائی۔ گلائی
گہار
گھاس
گھسیارا
گھاو
گھایل۔ گھائل
گھٹنا، گھٹانا، گھٹوانا
گھوٹنا
گھچ پچ
گھراو
گھگو
گھگی
گھگیانا
گھماو پھراو
گھناونی، گھناونا
گھنگچی
گھنگرو
گھنگریا
گھنگنیاں
گھنگولنا
گھونٹنا (گلا گھونٹنا)
گھونسا

گھونسلا
گھونگا
گھونگھٹ
گھونگر
گھٹی
گھیاں
گئو، گئودان
گئوشالا، گئو ہتیا
گیارہ، گیارھواں،
گیارھویں، گیارھوں
گیاں

لاسا
لالا (جیسے لالا درگا پرشاد)
لالہ (مشہور پھول)
لٹاؤ (لٹاؤ۔ لٹانے والا)
لٹاؤ (لٹاؤ۔ لٹانا کا فعل)
لچکا
لچھی
لذت
لذیذ
لفافہ
لقلقہ
لقمان
لکھیے، لکھیو
لگاؤ (لگانا کا حاصل مصدر
جیسے لاگ اور لگاؤ)
لگاؤ (لگانا سے فعل)
للہ (للّٰہ)
لمباؤ (لمباؤ چوڑاؤ)
لنگوٹا

لنہگا
لہار
لوٹا
لہریا، لہریے، لہریوں
لہڑا
لیت و لعل
لیجیے، لیجیو
لیٹی
لیے (لِ یِ ے - لینا
کا فعل)
لیے (جیسے میرے لیے)
مآثر
مارکا (جیسے: شیر مارکا)
مال گزاری
مانجھا
مانجھی
ماننا
ماوا (جائے پناہ)
ماہ رخ
ماہ رو
ماہ نامہ
مائل
مباح (جائز)
مبتذل
مباہات
مبدء
مبدءِ توکل
مبدءِ فیاض
مبدءِ فیض
مٹاپا
متبحر

متحیر
متضمن
متعذر
متعرض
متغیر
متعہ
متفحص
متنازع فیہ
متنبہ
مٹ بھیڑ
متمکن
متبع
مجتبا۔ مجتبیٰ
مجلا
مجلہ (رسالہ)
مجمع، مجمعے، مجمعوں
مجھ کو
مچھیرا
مچلکا
مچھندر
محاذی
محشا
محضر
محکمہ جات
محنتانہ
محیی (مخلوق کو زندہ
رکھنے والا، ناموں
کا جزء، جیسے:
محی الدین)
مخاصمت
مخروطی (گاؤ دم گاجر
کی وضع کا)

مخمصہ
مدعا
مدھیہ پردیش
مذاکرہ
مذلت
مرآت (آئینہ)
مرافعہ
مربا
مربع
مرثیہ، مرثیے، مرثیوں
مرتضا۔ مرتضیٰ
مردانہ
مردوا، مردوے، مردووں
مرزئی
مرغا
مرغزار
مرفہ الحال
مروتا
مرہٹا
مزرع، مزرعہ
مزائل
مژگاں
مژہ
مسا
مسالا
مستثنا
مسخرہ
مسرا (جیسے: للت نراین
مسرا)
مسل
مسما

مسمات
مشعلچی
مصرع، مصرعے، مصرعوں
مصطفا۔ مصطفیٰ
مصفا
مصلا
مضائقہ
مضحکہ
مطبع، مطبعے، مطبعوں
مطلع، مطلعے، مطلعوں
مطمئن
مع (جیسے: مع کتاب و قلم)
معائنہ
معلا
معما
معمائے حیات
مغلئی
مقراض
مقطع، مقطعے، مقطعوں
مقفا
مکئی
ملبا
ملغوبا
ملمع، ملمعے، ملمعوں
ملیدا
منادا
منجدھار
منجھولا، منجھولی
منڈاسا (پگڑی)
منقا
منہ

منہا منہ
مِنہ (مینہ کا مخفف)
مہندی
منہنگا، منہنگی، منہنگائی
منہنگ مولا
منہنال
منہیار
مواخذہ
موازنہ
موافق
موافقت
موثر
مونچھ
مؤدب
مؤذن
مورچا
مورخ
مورخہ
موزہ
موسیٰ، موسٰے
مؤسس
موضع، موضعے، موضعوں
موقر
موقع، موقعے، موقعوں
موکد
موکل
مولا
مولانا
مولف
مونث
موید

مہتا
مہوا
مہوبا
مہینا
مئی
مے (شراب)
مے صاف
میانا (ایک قسم کی پالکی)
میانہ (درمیانی، جیسے
میانہ قد، میانہ روی)
میسر
میلا
میلا
میل خورا
میں نے
میو
نا (تاکید کے لیے جیسے
آؤ نا)
ناتا (رشتہ ناتا،
رشتے ناتے)
ناڑا
ناشتا
ناشکرا
ناکا (ایک جانور،
سوئی کا ناکا، شہر
کا ناکا)
نالا (ندی نالا)
نالہ (آہ و نالہ)
نانو (نام)
ناو
نائب

نبھاؤ (ان سے نبھاؤ نہیں
ہو سکتا)
نبھاؤ (نبھانا کا فعل)
نتیجتاً
نخرا
ندیدا
نذر
نذرانہ
نذیر (نذیر احمد)
نراین ـ نرائن
نزہت
نژاد (اصل، نسب
نسل)
نژند (غمگین، پست
خوار)
نسبتاً
نشیلا
نصارا
نصیبا
نظر گزر
نظریہ، نظریے، نظریوں
نظیر (جیسے: بے نظیر شاہ،
نظیر اکبرآبادی)
نقشا، نقشہ
نقص

وائن
وائسرائے
وائے
وتیرہ
وسطا (مشرقِ وسطا)

وکٹوریا
ولایتی

ہاتھ
ہاتھی
ہامی بھرنا
ہائل (ہول ناک)
ہائے
ہائے ہائے
ہتّا
ہتی
ہتکڑی

ہتھ پھول
ہتھ پھیری
ہتھ چھٹ
ہتھ نال
ہتھنی
ہتیار
ہتیا لینا
ہتیلی
ہچکولا
ہرج
ہرجا
ہرجانا

ہرجا خرچا
ہرج مرج
ہمالا
ہم پایہ، ہم پایے،
ہم پایگی
ہمسایہ، ہمسایے، ہمسایوں،
ہمسایگی
ہندستانی
ہندو، ہندوؤں
ہنڈولا
ہنسیا، ہنسیے،
ہنسیوں

ہونٹ
ہونق
ہُوا، ہوئی، ہوئے
ہواد
ہیئر ڈریسر
ہیولا
ہیہات
ہیئت

یاسین
یحییٰ - یحیےٰ
یونی ورسٹی
یہ

آزمائش کی گھڑی

مصنف : سید حامد
صفحات : 136
قیمت : -/60روپے

اردو شاعری کی گیارہ آوازیں

مصنف : عبدالقوی دسنوی
صفحات : 184
قیمت : -/72روپے

تعلیم اور اس کے وسائل

مصنف : محمد اکرام خاں
صفحات : 160
قیمت : -/65روپے

مذہب اور ہندوستانی مسلم سیاست کل اور آج
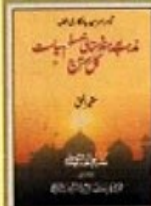
ترتیب : مشیر الحق
صفحات : 36
قیمت : -/36روپے

مفکرین تعلیم

مصنف : محمد اکرام خاں
صفحات : 184
قیمت : -/72روپے

انتخاب نظیر اکبرآبادی

مصنف : رشید حسن خاں
صفحات : 280
قیمت : -/77روپے

شریف زادہ

مصنف : مرزا رسوا
صفحات : 200
قیمت : -/62روپے

تنقید کیا ہے

مصنف : آل احمد سرور
صفحات : 200
قیمت : -/62روپے

ISBN: 978-81-7587-539-5

₹ 45/-